سوال تمہارے
جواب ہمارے

اہل سنت اور شیعہ حضرات کے مابین دس اہم موضوع بحث
مسائل کی تحقیق

تالیف
آیت اللہ العظمیٰ آقای مکارم شیرازی مدظلہ
قم المقدسہ ایران

بسم الله الرحمن الرحيم

سوال تمہارے
جواب ہمارے

اہل سنت اور شیعہ حضرات کے مابین دس اہم مورد بحث
مسائل پر تحقیق

مؤلف

آیۃ اللہِ العظمیٰ آقای مکارم شیرازی مدظلہ

قم المقدسہ ایران

معارف اسلام پبلشرز قم ایران

جملہ حقوق طبع بحق معارف اسلام پبلشرز محفوظ ہیں

نام کتاب	......	سوال تمہارے جواب ہمارے
مؤلف	......	آیت اللہ العظمی مکارم شیرازی
مترجم	......	معارف اسلام پبلشرز
ناشر	......	انتشارات نور معاف
اشاعت	......	پہلی
تاریخ اشاعت	......	ربیع الثانی ۱۴۲۹ ھ ق
تعداد	......	۵۰۰۰
ہدیہ	......	۱۲۵ روپے

معارف اسلام پبلشرز قم ایران

فہرست مطالب

فہرست مطالب

مقدمہ ۷

پہلی فصل:
قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے

عدم تحریف قرآن ۱۳
فریقین کی دو کتابیں ۱۳
فرقہ وارانہ دشمنی کی خاطر اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا نہ کیا جائے ۱۶
عدم تحریف پر عقلی اور نقلی دلیلیں: ۱۹
اختتامیہ کلمات ۲۲

دوسری فصل:
"تقیہ" قرآن وسنت کے آئینہ میں

۱۔ تقیہ کیا ہے؟ ۲۷
۲۔ تقیہ اور نفاق کا فرق ۲۸

۳۔ تقیہ عقل کے ترازو میں ۔۔۔۔۔ ۲۸
۴۔ تقیہ کتاب الٰہی میں ۔۔۔۔۔ ۲۹
۵۔ تقیہ، اسلامی روایات میں ۔۔۔۔۔ ۳۲
۶۔ کیا تقیہ صرف کفار کے مقابلے میں ہے ۔۔۔۔۔ ۳۳
۷۔ حرام تقیہ ۔۔۔۔۔ ۳۶
۸۔ مصلحت آمیز تقیہ ۔۔۔۔۔ ۳۸

تیسری فصل:

عدالت صحابہ

۱۔ دو متضاد عقیدے ۔۔۔۔۔ ۴۳
۲۔ تنزیہ کے سلسلہ میں عدت پسندی: ۔۔۔۔۔ ۴۴
۳۔ لاجواب سوالات ۔۔۔۔۔ ۴۵
۴۔ صحابہ کون ہیں؟ ۔۔۔۔۔ ۴۸
۵۔ "عقیدہ تنزیہ" کا اصلی سبب ۔۔۔۔۔ ۵۰
۶۔ کیا تمام اصحاب بغیر استثناء کے عادل تھے؟ ۔۔۔۔۔ ۵۵
۷۔ اصحاب پیغمبرؐ کی اقسام ۔۔۔۔۔ ۶۳
۸۔ تاریخی گواہی ۔۔۔۔۔ ۶۵
۹۔ پیغمبرؐ کے زمانے میں یا اس کے بعد بعض صحابہ پر حد کا جاری ہونا ۔۔۔۔۔ ۶۸
۱۰۔ نادرست توجیہات ۔۔۔۔۔ ۷۰
۱۱۔ مظلومیت علی علیہ السلام ۔۔۔۔۔ ۷۲
۱۲۔ ایک دلچسپ داستان ۔۔۔۔۔ ۷۴

چوتھی فصل:

بزرگوں کی قبروں کا احترام

اجمالی خاکہ ۔۔۔۔۔ ۷۹
زیارت قبول کی گذشتہ تاریخ ۔۔۔۔۔ ۸۱
قبور کی زیارت کے سلسلہ میں شرک کا وہم: ۔۔۔۔۔ ۸۲
کیا شفاعت طلب کرنا توحیدی نظریات کے ساتھ سازگار ہے؟ ۔۔۔۔۔ ۸۴
اولیائے الٰہی کی شفاعت صرف ظاہری زندگی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے! ۔۔۔۔۔ ۸۷
ہم ان متضاد باتوں کو کیسے قبول کریں! ۔۔۔۔۔ ۸۸
خواتین اور قبور کی زیارت ۔۔۔۔۔ ۸۹
"شد رحال" فقط تین مساجد کے لیے جائز ہے؟ ۔۔۔۔۔ ۹۰
کیا قبور پر عمارت بنانا ممنوع ہے؟ ۔۔۔۔۔ ۹۲
وہابیت کے ہاتھوں ثقافتی میراث کی بربادی ۔۔۔۔۔ ۹۳
بہانے ۔۔۔۔۔ ۹۵
۱۔ قبروں کو مسجد نہیں بنانا چاہیے ۔۔۔۔۔ ۹۵
۲۔ ایک اور بہانہ ۔۔۔۔۔ ۹۷
بزرگان دین کی قبور کی زیارت کے مثبت آثار ۔۔۔۔۔ ۹۹
۳۔ تبرک چاہنا اور طلب کرنا ممنوع ہے ۔۔۔۔۔ ۱۰۰
علمائے اسلام کی اہم ذمہ داری ۔۔۔۔۔ ۱۰۱

پانچویں فصل:
نکاح موقت (متعہ)

متعہ یا ازدواج موقت ۱۰۵
۱۔ ضرورت اور نیاز ۱۰۵
نکاح مسیار ۱۰۷
متعہ کیا ہے؟ ۱۰۹
سوء استفادہ ۱۱۲
نکاح متعہ قرآن وسنت اور اجماع کی روشنی میں ۱۱۳
کس نے متعہ کو حرام کیا ۱۱۷
الف) خلیفۂ اول کے دور میں متعہ کا حلال ہونا ۱۱۸
ب) اجتہاد در مقابل نص ۱۱۸
ج) حضرت عمر کی مخالفت کا سبب ۱۱۹
د) متعہ کی تحریم کے بعد لوگوں کا ردعمل ۱۲۱
بہترین راہ حل ۱۲۵

چھٹی فصل:
زمین پر سجدہ

۱۔ عبادات میں سجدہ کی اہمیت ۱۳۱
۲۔ غیر خدا کے لیے سجدہ کرنا جائز نہیں ہے ۱۳۲
۳۔ کس چیز پر سجدہ کرنا چاہیے؟ ۱۳۳
۴۔ مسئلہ کی وضاحت ۱۳۷

الف) زمین پر سجدہ کے حوالے سے معروف حدیث نبوی ۱۳۷
ب) سیرت پیغمبرؐ ۱۳۹
ج) صحابہ اور تابعین عظام کی سیرت ۱۴۰

ساتویں فصل:
جمع بین صلاتین

بیان مسئلہ ۱۴۵
اسلامی معاشروں میں پانچ اوقات پر اصرار کے آثار ۱۴۷
دو نمازوں کو اکٹھا پڑھنے کے جواز پر روایات ۱۴۹
۱۔ مذکورہ احادیث کا نتیجہ ۱۵۳
۲۔ قرآن مجید اور نماز کے تین اوقات ۱۵۵

آٹھویں فصل:
وضو میں پاؤں کا مسح

قرآن مجید اور پاؤں کا مسح ۱۶۳
عجیب توجیہات ۱۶۶
نص کے مقابلے میں اجتہاد اور تفسیر بالرائی ۱۶۸
جوتوں پر مسح کرنا! ۱۷۱
پاؤں پر مسح اور احادیث اسلامی: ۱۷۲
مخالف روایات ۱۷۸
سہل اور آسان شریعت ۱۸۰
نعوذ باللہ من ہذہ الاکاذیب ۱۸۳

جوتوں پر مسح، عقل و شرع کے ترازو میں ۱۸۳
روایات چند اقسام پر مشتمل ہیں: ۱۸۶
بحث کا آخری نتیجہ: ۱۹۳

نویں فصل:
بسم اللہ، سورۃ الحمد کا جز ہے

ایک تعجب آور نکتہ ۱۹۷
بسم اللہ کے بلند آواز سے پڑھنے کے بارے میں احادیث نبویؐ ۲۰۲
مابین الدفتین قرآن ہے ۲۱۰
بحث کا خلاصہ ۲۱۱

دسویں فصل:
اولیائے الٰہی سے توسل

"توسل" قرآنی آیات اور عقل کے آئینہ میں: ۲۱۷
توسل احادیث کی روشنی میں ۲۲۶
چند قابل توجہ نکات ۲۳۳
۱۔ دوہائیوں کے بہانے ۲۳۳
۲۔ "افراطی اور غالی افراد" ۲۳۶
۳۔ تنہا توسل کافی نہیں ہے ۲۳۷
۴۔ امور تکوینی میں توسل ۲۳۸
فہرست منابع ۲۴۳

مقدمہ:

حمد ہے اس ذات کے لیے جس نے انسان کو قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا اور درود و سلام ہو اس نبی پر جسے اس نے عالمین کے لیے سراپا رحمت بنا کر مبعوث فرمایا اور سلام و رحمت ہو ان کی آل پر جنہیں اس نے پورے جہاں کے لیے چراغ ہدایت بنایا۔

اما بعد: آپ کے ہاتھوں میں موجود کتاب کے عظیم مصنف نے اس میں اسلام کے مختلف مکاتب فکر کے درمیان پائے جانے والے دس اختلافی مسائل پر انتہائی مختصر، عام فہم اور منصفانہ بحث کی ہے۔

مصنف کی روش یہ ہے کہ ایک مسئلہ کو پیش کر کے اس پر طرفین کی ادلہ ذکر کرتے ہیں اور آخر میں نتیجہ قارئین محترم پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ قارئین کرام خود فیصلہ کر سکیں کہ حق کس کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کتاب کے ترجمہ کی سعادت و توفیق بھی معارف اسلام پبلشرز کو عنایت فرمائی ہے اور اس خوبصورت ترجمہ کی زحمت فاضل برادر جناب آقای سید محسن علی کاظمی نے اٹھائی ہے۔ خدا ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے درمیان وحدت کا باعث بنے گی۔

معارف اسلام پبلشرز

مقدمہ

یہ راستہ وحدت کی طرف نہیں جاتا!

اس دنیا کے موجودہ حالات پر ایک اجمالی نگاہ دوڑانے سے پتہ چلتا ہے کہ شدید طوفان چل رہے ہیں، پردے ہٹ چکے ہیں، دلفریب باتوں، انسانی حقوق کے دعوے، ڈیموکریسی اور اقوام متحدہ جیسے بین الاقوامی اداروں کے نعروں کی حیثیت واضح ہو چکی ہے۔ عالمی طاقتوں نے دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے خطرناک سازشیں آمادہ کر رکھی ہیں اور وہ کھلے لفظوں میں اپنے دل کی باتوں کو بیان کر رہے ہیں۔

اور کتنا اچھا ہوا کہ انہوں نے ان تمام باتوں کا اظہار کر دیا ہے اور اپنے اوپر بے جا اعتماد کرنے والوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا ہے۔ اور اب اللہ تعالیٰ کے لطف وعنایت کے بعد قوموں کی اپنی قدرت وطاقت کے علاوہ کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہی ہے۔ ہاں اپنے آپ کو طاقتور بنانا چاہیے کیونکہ دنیا کے اس نظام میں کمزور کو پائمال کیا جاتا ہے۔

ان شرائط میں اگر پوری دنیا کے مسلمان متحد ہو جائیں اور اپنی عظیم ثقافتی اور مادی طاقت کو استعمال کریں تو اسی صورت میں طاغوتی طاقتوں کے شر سے امان میں رہ سکتے ہیں۔ کئی سالوں سے ہر جگہ وحدت مسلمین کی باتیں زبانوں پر جاری ہیں۔ ہفتہ وحدت کی تشکیل، وحدت کے

سلسلہ میں کانفرنسوں اور سیمیناروں کے انعقاد کی خبروں کا چرچا ہے۔

اگرچہ ان اقدامات کے سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں اچھے آثار سامنے آئے ہیں اور دشمن خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان اقدامات سے ایسی وحدت وجود میں نہیں آئی جس کا لازمہ ان عظیم طوفانوں کے مقابلے میں ڈٹ جانا اور مقاومت کرنا ہو۔

اس بات کے اسباب کو چند امور میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اس سلسلہ میں کیے جانے والے اقدامات بنیادی نہیں تھے جس کی وجہ سے مسئلہ وحدت اسلامی، معاشروں کے عمق اور مسلمانوں کے افکار میں نفوذ نہیں کرسکا ہے تاکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک ہی راستے پر لگا کرتا۔

۲۔ دشمنوں نے بدگمانی، سوء ظن، اختلاف اور نفاق ایجاد کرنے کیلئے وسیع پیمانے پر کام کیا ہے۔ اور جس طرح خبروں سے اندازہ ہوتا ہے انہوں نے ان مسائل کو عملی بنانے کے لیے مادی اعتبار سے بھی بہت بھاری سرمایہ مختص کیا ہوا ہے اور اپنے شوم مقاصد کو پورا کرنے کے لئے دونوں طرف سے متعصب اور شدت پسند افراد کو استعمال کرتے ہیں۔ من جملہ

الف) ہمیں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حال ہی میں سعودی عرب کے متعصب سلفیوں نے ایک کروڑ تفرقہ انگیز کتابیں چھپوا کر حجاج کے درمیان تقسیم کی ہیں اور حج جو مسلمانوں کی وحدت کا ذریعہ تھا، کو نفاق کے وسیلہ میں تبدیل کر دیا ہے اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے کام ہر سال کیے جاتے ہیں۔

ب) حج اور عمرہ کے ایام میں متعصب وہابی خطیب نفاق پیدا کرنے کے لیے زہر اگلنے کا کام کرتے ہیں اور ایران و سعودی عرب کے اچھے تعلقات کے باوجود انہوں نے شیعوں کے

خلاف حملے اور زیادہ کردیے ہیں۔

ج) سپاہ صحابہ کے حملے اور مظلوم و بے گناہ افراد کا وحشیانہ قتل، اور اس سے بھی زیادہ افسوس کہ اس قتل و غارت اور دہشت گردی پر فخر کرنا ہے جسے آئے دن تھوڑے وقفے انجام دیا جاتا ہے۔ یہ بات سب لوگوں پر عیاں ہے۔

د) طالبان جیسے تنہا پسند گروہوں کو اکسانا، شواہد کے مطابق یہ کام بھی امریکی ایجنسیوں کی طرف سے انجام پانے والا ایک خطرناک کام تھا تاکہ ایک طرف تو اسلام کے چہرے کو بدنما، بے رحم اور علم و دانش اور تہذیب و تمدن سے بے بہرہ ظاہر کریں اور دوسری طرف مسلمانوں کے درمیان تفریق کو زیادہ کریں۔ اگرچہ یہ مغربی سیاست کے سائے میں پلنے والا گروہ آخرکار ان کے کنٹرول سے خارج ہو گیا تھا اور خود ان ہی کے خلاف برسرپیکار ہو گیا تھا۔ اسطرح جب امریکہ کو اپنے نمک خواروں کے تلخ نتائج کا سامنا کرنا پڑا تو وہ ان کے ختم کرنے کے درپے ہوا۔

۳۔ بعض اسلامی سیاستدانوں کی کوتاہ فکری بھی پائیدار وحدت کے اہداف کے حصول میں مانع ثابت ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنے محدود اور وقتی منافع کو، عالم اسلام کے طولانی منافع پر مقدم کیا۔ مثال کے طور پر ہم بعض اسلامی ممالک کو جانتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے محدود اور کم اہمیت منافع کی خاطر اسرائیل کے ساتھ بہت زیادہ سیاسی اور اقتصادی تعاون کیا، یہاں تک کہ اس کے ساتھ مشترکہ جنگی مشقیں کیں اور یہ بات آج سب پر آشکار ہو چکی ہے۔

بہرحال جو چیز علمائے اسلام کے اختیار میں ہے وہ یہ کہ ضمناً ان غلطیوں کے برے نتائج کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اور اس جانب متوجہ کرتے ہوئے کہ کوئی ملک یا سیاسی گروہ ان

اسلام دشمن طاغوتی طاقتوں کی ظالمانہ اور بے رحم سیاست سے امان میں نہیں رہے گا، یہ کریں کہ جہاں تک ممکن ہو مذہبی مسائل کو شفاف بنائیں تا کہ دشمنوں کو زہر اگلنے اور انتہا پسند و متعصب گروہوں کو سوءظن پیدا کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

اس نکتہ کے پیش نظر ہم نے اس کتاب میں کہ جو قارئین محترم کے ہاتھ میں ہے، مسلمانوں کی صفوں کو تقویت پہنچانے کے لئے ایک جدید اور دلکش روش سے استفادہ کیا ہے۔ اس روش میں یہ مسئلہ مکمل طور پر روشن ہو جائیگا کہ مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں اور اہلسنت کے درمیان اہم اختلافی مسائل کی بنیاد خود انکی اپنی مشہور کتابیں ہیں اور ان مسائل میں شیعہ حضرات کے نظریات کی واضح اور روشن دلیلیں اہل سنت کی اپنی کتابوں میں موجود ہیں۔ اہلسنت کے ایک آزاد عالم دین کے بقول "شیعہ اپنے مذہب کے تمام اصول اور فروع کو ہماری کتب سے ثابت کر سکتے ہیں"۔

اگر یہ بات ثابت ہو جائے، کہ انشاء اللہ اس کتاب میں ثابت ہو جائیگی، تو پھر مکتب اہلبیتؑ کے پیروکاروں کے عقائد کی نسبت کسی طرح کے تردد، مذمت یا شبہ ایجاد کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ بلکہ یہ بات یقیناً منطقی اور منصف مزاج افراد سے سوءظن کو برطرف کرنے اور مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے نیز حسن ظن رکھنے کا باعث بنے گی اور ایران جو ایک قدرتمند اسلامی ملک ہے اسی طرح اسلام کے مدافع کے اعتبار سے باقی رہے گا، اور اسی طرح تمام شیعیان جہان بھی۔ اب حضور والا! آپ اور یہ ہماری دلیلیں!

قرآن ہر قسم کی تحریف سے منزہ ہے

عدم تحریف قرآن:

شیعوں کے خلاف ہونے والے جھوٹے پروپیگنڈے کے برعکس ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ آج جو قرآن مجید ہمارے اور تمام مسلمانوں کے پاس ہے یہ بالکل وہی قرآن مجید ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور اس میں حتیٰ ایک لفظ کی بھی کمی وزیادتی نہیں ہوئی ہے۔ ہم نے اس مسئلے کو اپنی تفسیر، اصول فقہ وغیرہ کی متعدد کتب میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور عقلی و نقلی ادلّہ کے ذریعہ سے ثابت کیا ہے۔

ہم قائل ہیں کہ تمام مسلمان علماء اعم از شیعہ و سنی کا اس بات پر اجماع ہے کہ قرآن مجید میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوا ہے اور دونوں مذہب کے محققین کی اکثریت جو اتفاق کے قریب ہے اس بات کی قائل ہے کہ اس میں کسی قسم کی کمی بھی واقع نہیں ہوئی ہے۔

دونوں طرف کے چند گنے چنے افراد اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن مجید میں کمی واقع ہوئی ہے جبکہ مشہور علماء اسلام ان کی اس بات کے طرفدار نہیں ہیں۔

فریقین کی دو کتابیں:

ان گنتی کے چند علماء میں سے ایک اہل سنت عالم دین "ابن الخطیب مصری" ہیں جنہوں نے "الفرقان فی تحریف القرآن" نامی کتاب لکھی جو ۱۹۴۸ عیسوی بمطابق

(۱۳۶۷ ہجری قمری) میں نشر ہوئی۔ لیکن بروقت الازہر یونیورسٹی کے علماء اس کتاب کی طرف متوجہ ہوگئے اور انہوں نے اس کتاب کے نسخوں کو جمع کر کے ضائع کر دیا لیکن اس کے چند نسخے غیر قانونی طور پر آس پاس کے لوگوں تک پہنچ گئے۔

اسی طرح ایک کتاب (فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الأرباب) کے نام سے شیعہ محدث حاجی نوری کے توسط سے لکھی گئی جو ۱۲۹۱ ہجری قمری میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی حوزہ علمیہ نجف اشرف کے بزرگ علماء نے اس کتاب کے مطالب سے اظہار برائت کیا اور اس کتاب کی جمع آوری کا حکم دے دیا۔ اور اس کے بعد کئی کتابیں اس کے رد میں لکھی گئیں۔ جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔

۱۔ نامور فقیہ مرحوم محمود بن ابی القاسم المعروف بہ معرب طہرانی (متوفی سال ۱۳۱۳ھ۔ق) نے (کشف الارتیاب فی عدم تحریف الکتاب) نامی کتاب لکھی جو کتاب فصل الخطاب کا رد تھا۔

۲۔ مرحوم علامہ سید محمد حسین شہرستانی (متوفی ۱۳۶۵ھ۔ق) نے بھی ایک کتاب بنام (حفظ الکتاب الشریف عن شبهة القول بالتحریف) حاجی نوری کی کتاب فصل الخطاب کے جواب میں لکھی۔

۳۔ مرحوم علامہ بلاغی (متوفی ۱۳۵۲ھ۔ق) حوزہ علمیہ نجف کے عظیم محقق نے بھی اپنی مشہور کتاب (تفسیر آلاء الرحمن) میں ایک قابل ملاحظہ باب فصل الخطاب کے رد میں لکھا ہے(۱)

(۱) آلاء الرحمن جلد ۱ ص [illegible]۔

۴۔ ہم نے بھی اپنی کتاب (انوار الاصول) میں عدم تحریف قرآن مجید کے بارے میں اچھی مفصل بحث کی ہے اور فصل الخطاب کے شبہات کا دندان شکن جواب دیا ہے۔

مرحوم حاجی نوری اگرچہ عالم دین تھے لیکن بقول علامہ بلاغی انہوں نے ضعیف روایت پر اعتبار کیا ہے اور مذکورہ کتاب شائع ہونے کے بعد خود بھی نادم و پشیمان ہوئے۔ اور حوزہ علمیہ نجف اشرف کے تمام بزرگ علماء نے اس اقدام کو واضح طور پر ایک غلطی قرار دیا ہے۔(۱)

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب فصل الخطاب کے شائع ہونے کے بعد ہر طرف سے حاجی نوری کی مخالفت کا ایسا عظیم طوفان اٹھا کہ وہ خود اپنے دفاع میں ایک رسالہ لکھنے پر مجبور ہوگئے جس میں انہوں نے لکھا کہ میری مراد عدم تحریف قرآن مجید تھی لوگوں نے میری تعبیرات سے سوء استفادہ کیا ہے۔(۲)

مرحوم علامہ سید ھبۃ الدین شہرستانی کہتے ہیں کہ میں اس وقت سامرا میں تھا اور میرزا شیرازی بزرگ نے اس وقت سامرا کو علم و دانش کا مرکز بنا دیا تھا۔ جس محفل میں بھی ہم جاتے ہر طرف سے حاجی نوری اور ان کی کتاب کے خلاف صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ اور بعض لوگ تو حاجی نوری کو نازیبا الفاظ کے ساتھ یاد کرتے تھے(۳)

کیا اتنی مخالفت کے باوجود بھی حاجی نوری کی باتوں کو شیعہ عقیدہ شمار کرنا چاہیے؟ بعض

(۱) آلاء الرحمن جلد ۱ ص [illegible]۔
(۲) الذریعہ جلد [illegible] ص [illegible]۔
(۳) [illegible] ص [illegible]۔

متعصب وہابی اس کتاب (فصل الخطاب) کو بہانہ بنا کر تحریف قرآن کے نظریہ کو شیعوں کی طرف نسبت دیتے ہیں حالانکہ:

۱۔ ایک کتاب کی تالیف اس مسئلہ میں شیعہ عقیدہ پر دلیل بن سکتی ہے تو پھر اس تحریف قرآن والے نظریہ کو علمائے اہل سنت کی طرف بھی نسبت دینی چاہیے کیونکہ ابن الخطیب مصری نے بھی تو (الفرقان فی تفسیر القرآن) نامی کتاب لکھی تھی اور اگر جامعۃ الازہر کے علماء کی تردید اس کتاب کے مطالب کی نفی پر دلیل بن سکتی ہے تو علمائے نجف اشرف کا اظہار برائت بھی فصل الخطاب کے مفاہیم کی نفی پر دلیل بن سکتا ہے۔

۲۔ اہل سنت کی دو مشہور تفاسیر تفسیر قرطبی، اور تفسیر در المنثور میں حضرت عائشہ (زوجہ رسولؐ) سے نقل کیا گیا ہے کہ:

(و الله ـ ای سورۃ الاحزاب (۱۱) کانت مائتی آیۃ فلم یبق منها الا ثلاث و سبعین.)(۱)

سورۃ الاحزاب کی ۲۰۰ آیات تھیں، ور اب ۷۳ سے زیادہ باقی نہیں بچی ہیں!

اس سے بڑھ کر صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی ایسی روایت نظر آتی ہیں جن سے تحریف کی بو آتی ہے (۲)

لیکن ہم ہرگز کسی ایک مصنف یا چند ضعیف روایات کی وجہ سے تحریف والے قول کو اہل سنت کی طرف نسبت نہیں دیتے ہیں۔

اسی طرح انہیں بھی کسی ایک مصنف یا چند ضعیف روایات کی وجہ سے کہ جنکا جمہور علمائے

۱) تفسیر قرطبی، جلد ۱۴، ص ۱۱۳، و تفسیر الدر المنثور، جلد ۵، ص ۱۸۰۔

۲) صحیح بخاری، جلد ۸، ص ۲۰۸ تا ۲۱۱، و صحیح مسلم، جلد ۳، ص ۱۶۷، و جلد ۵، ص ۱۱۶۔

شیعہ نے انکار کیا ہے، اس قول تحریف کو شیعوں کی طرف نسبت نہیں دینی چاہیے۔

۳۔ حاجی نوری کی کتاب فصل الخطاب میں عام طور پر ان تین راویوں سے احادیث لی گئی ہیں کہ جو یا تو فاسد المذہب، یا کذاب اور جھوٹے یا مجہول الحال ہیں۔ (احمد ابن محمد السیاری، فاسد المذہب، علی ابن احمد کوفی، کذاب، اور ابی الجارود مجہول یا مردود) (۱)

فرقہ وارانہ دشمنی کی خاطر اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا نہ کیا جائے۔

۴۔ جن لوگوں کا اصرار ہے کہ مذہب شیعہ کو تحریف قرآن کے عقیدہ سے متہم کیا جائے، گویا وہ اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہیں کہ فرقہ وارانہ خصومت کی خاطر وہ اسلام کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ کیونکہ غیر مسلم لوگ کہیں گے کہ عدم تحریف کا عقیدہ مسلمانوں کے درمیان مسلم اور حتمی عقیدہ نہیں ہے۔

کیونکہ ایک عظیم گروہ تحریف قرآن کا قائل ہے۔ ہم ان بھائیوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ فرقہ واریت اور تعصب آمیز دشمنی کی خاطر قلب اسلام یعنی قرآن مجید کو نشانہ نہ بنائیں۔ آیئے اسلام اور قرآن پر رحم کیجئے اور بے جا تحریف کی باتوں کو اچھال کر دشمن کو موقع فراہم نہ کیجئے۔

۵۔ شیعوں کے خلاف یہ تہمت اور افترا اس قدر پھیل چکی ہے کہ ایک مرتبہ ہم عمرہ کی خاطر بیت اللہ مشرف ہوئے۔ سعودی عرب کے وزیر مذہبی امور سے ہماری ملاقات ہوئی اس نے ہمارا پر تپاک استقبال کیا۔ لیکن کہنے لگا تمہارا قرآن ہمارے قرآن سے مختلف ہے (مصحف ان لکم مصحفا غیر مصحفنا)!!

۱) ان تینوں راویوں کے بارے معلومات کے لیے رجال نجاشی، فہرست شیخ، اور دیگر رجالی کتب کی طرف رجوع کیا جائے۔

میں نے جواب میں کہا، اس بات کو آزمانا انتہائی آسان ہے۔ آپ خود ہمارے ساتھ تشریف لے چلیے یا اپنے نمائندہ بھیج دیں (تمام اخراجات ہمارے ذمہ ہوں گے) واپس تہران چلے چلتے ہیں۔ قرآن مجید تمام مساجد اور گھروں میں موجود ہیں۔ تہران میں ہزاروں مسجدیں اور لاکھوں گھر ہیں۔ مسجد یا گھر کا انتخاب آپکے نمائندے کے اختیار میں ہوگا۔ وہ جس گھر کا انتخاب کرے گا ہم اس دروازے پر دستک دیکر قرآن مجید طلب کریں گے اس وقت آپ دیکھ لینا کہ شیعوں کے گھروں میں موجود قرآن مجید، دیگر مسلمان ممالک کے قرآن مجید کے ساتھ ایک لفظ کا بھی فرق نہیں رکھتا ہے۔ آپ جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو اس قسم کی جھوٹی افواہوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے!

۲۔ ہمارے بہت سے قاری، انٹرنیشنل مقابلہ قرأت میں اول نمبر پر آئے ہیں۔ ہمارے حافظ، بالخصوص ہمارے کمسن حفاظ نے بہت سے اسلامی ممالک میں تعجب خیز اور قابل تحسین قرآنی منظر پیش کیے ہیں۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ہمارے حفاظ اور قاریوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہمارے وسیع و عریض ملک میں جگہ جگہ حفظ، قرأت، تفسیر قرآن کی کلاسیں اور علوم قرآن کے کالج و یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ ان تمام چیزوں کا اثبات نزدیک سے مشاہدہ کے ذریعہ تمام لوگوں کے لئے آسان ہے۔

ان تمام موارد میں صرف اسی قرآن مجید سے استفادہ کیا جاتا ہے جو تمام مسلمان ممالک میں متداول ہے اور ہمارا کوئی بھی باشندہ اس معروف قرآن کے علاوہ کسی دوسرے قرآن کو نہیں پہچانتا ہے۔ اور ہمارے ہاں کسی بھی مجلس یا محفل میں تحریف قرآن کی بات نہیں کی جاتی ہے۔

عدم تحریف پر عقلی اور نقلی دلیلیں:

۷۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق بہت سے عقلی و نقلی دلائل موجود ہیں جو قرآن مجید کی عدم تحریف پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ ایک تو خود قرآن مجید فرماتا ہے، (انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون) (ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا اور اس کی حفاظت بھی ہمارے ذمہ ہے(۱) ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے:

(و انہ لکتاب عزیز، لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ و لا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید)(۲)

"یہ کتاب شکست ناپذیر ہے۔ اس میں باطل اصلاً راہ نہیں کر سکتا ہے نہ سامنے سے اور نہ پیچھے کی طرف سے کیونکہ یہ حکیم و حمید خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے"

کیا اس قسم کی کتاب جسکی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہو اس میں کوئی تحریف کر سکتا ہے؟!

اور ویسے بھی قرآن مجید کوئی متروک اور بھلائی گئی کتاب نہیں تھی کہ کوئی اس میں کمی یا زیادتی کر سکے۔

کاتبان وحی کی تعداد چودہ سے لیکر تقریباً چار سو (۴۰۰) تک نقل کی گئی ہے۔ جیسے ہی کوئی آیت نازل ہوتی یہ افراد فوراً اسے لکھ لیتے تھے۔ علاوہ بر این سینکڑوں حافظ قرآن پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں تھے جو آیت کے نازل ہوتے ہی اس کو حفظ کر لیتے تھے اور قرآن مجید کی

۱) سورۂ حجر آیت ۹۔
۲) سورۂ فصلت آیت ۴۱-۴۲۔

تلاوت کرنا اس زمانے میں انکی سب سے اہم عبادت شمار ہوتی تھی۔ اور دن رات قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی تھی۔

اس سے بڑھ کر قرآن مجید، اسلام کا بنیادی قانون اور مسلمانوں کی زندگی کا آئین و اصول تھا اور زندگی کے ہر شعبے میں قرآن مجید حاضر و موجود تھا۔

عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ ایسی کتاب میں تحریف اور کسی کمی اور زیادتی کا امکان نہیں ہے۔

آئمہ معصومینؑ سے جو روایت ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی قرآن مجید کی عدم تحریف اور تمامیت پر تاکید کرتی ہیں۔

امیر المومنین علیؑ نہج البلاغہ میں واضح الفاظ میں فرماتے ہیں،

(انزل عليكم الكتاب تبيانا لكل شيء و عمر فيكم نبيه ازمانا حتى اكمل له و لكم فيما انزل من كتابه دينه الذي رضي لنفسه)(۱)

(اللہ تعالی نے ایسا قرآن مجید نازل کیا جو ہر شے کو بیان کرتا ہے پھر اس نے اپنے پیغمبر کو اتنی عمر عطا فرمائی کہ وہ اپنے دین کو تمہارے لیے قرآن مجید کے وسیلے کامل کر دیں۔

نہج البلاغہ کے خطبوں میں بہت سے مقامات پر قرآن مجید کا تذکرہ ہوا ہے لیکن کہیں بھی قرآن مجید کی تحریف سے متعلق ذرہ برابر اشارہ نہیں ملتا بلکہ قرآن مجید کے کامل ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔

۱) نہج البلاغہ خطبہ ۸۶۔

نویں امام حضرت امام محمد تقیؑ اپنے ایک صحابی کو لوگوں کے حق سے منحرف ہو جانے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

(و كان من نبذهم الكتاب ان اقاموا حروفه و حرفوا حدوده)(۱)

بعض لوگوں نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا ہے وہ اس طرح کہ اس کے الفاظ کو انہوں نے حفظ کر لیا ہے اور اس کے مفاہیم میں تحریف کی ہے۔

یہ اور اسکی مانند دیگر احادیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اس کے معانی میں تحریف ہوئی ہے۔ بعض لوگ اپنی خواہشات اور ذاتی منافع کی خاطر آیات کی خلاف واقع تفسیر و توجیہ کرتے ہیں۔ یہاں سے ایک اہم نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر بعض روایات میں تحریف کی بات ہوئی بھی ہے تو اس سے تحریف معنوی اور تفسیر بالرائی مراد ہے نہ الفاظ و عبارات کی تحریف۔

دوسری طرف سے بہت سی معتبر روایات جو آئمہ معصومینؑ سے ہم تک پہنچی ہیں میں بیان کیا گیا ہے کہ روایات کے صحیح و ناصحیح ہونے کی تشخیص کے لیے بالخصوص جب انکے درمیان ظاہراً تضاد و اختلاف پایا جا رہا ہو تو معیار قرآن مجید کے ساتھ تطبیق دینا ہے۔ جو حدیث قرآن مجید کے مطابق ہو وہ صحیح ہے اس پر عمل کیا جائے اور جو حدیث قرآن مجید کے خلاف ہو اسے چھوڑ دیا جائے۔

۱) کافی جلد ۸ ص ۵۳۔

(اعرضوا هما على كتاب الله فما وافق كتاب الله فخذوه وما خالف كتاب الله فردوه)(۱)

یہ بالکل واضح دلیل ہے کہ قرآن مجید میں تحریف نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ اگر تحریف ہو جاتی تو قرآن مجید حق و باطل کی تشخیص کا معیار قرار نہیں پا سکتا تھا۔

ان تمام ادلہ سے بڑھ کر مشہور حدیث "حدیث ثقلین" شیعہ و اہل سنت کتابوں میں کثرت کے ساتھ نقل ہوئی ہے(۲) جس میں پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

(انی تارک فیکم الثقلین کتاب الله و عترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا)

میں تمہارے درمیان دو یادگار گرانبہا چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت ہے اگر ان دونوں سے تمسک رکھا تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔

یہ پر مغز حدیث شریف بالکل واضح کر رہی ہے کہ قرآن مجید، عترت پیغمبرؐ کے ساتھ قیامت تک لوگوں کی ہدایت کے لیے ایک انتہائی مطمئن پناہ گاہ ہے۔ اب اگر قرآن مجید خود تحریف کا شکار ہو جاتا تو وہ کس طرح لوگوں کے لئے ایک مطمئن پناہ گاہ بن سکتا تھا اور انہیں ہر قسم کی گمراہی سے نجات دلا سکتا تھا۔

اختتامیہ کلمات: آخری بات یہ ہے کہ اللہ تعالی کے نزدیک یہ گناہ کبیرہ ہے کہ کسی پر ایسی بات یا ایسے کام کی تہمت لگائی جائے جو اس نے نہ کی ہو یا اسے انجام نہ دیا ہو۔

(۱) وسائل الشیعہ، جلد ۱۸ ص ۸۰۔

ہم نے ہر مقام پر کہا ہے اور اب بھی کہتے ہیں کہ مذہب شیعہ کے علماء و محققین میں سے کوئی بھی (خود انکی اپنی کتابوں کی گواہی کے مطابق) تحریف کا قائل نہیں تھا اور نہ ہے۔ لیکن پھر بھی بعض متعصب اور ہٹ دھرم قسم کے لوگ اس تہمت پر اصرار کرتے ہیں۔ پتہ نہیں قیامت والے دن وہ کیا جواب دیں گے کیونکہ ایک طرف تو تہمت لگا رہے ہیں اور دوسری طرف قرآن مجید کی اہمیت کو کم کر رہے ہیں۔

اگر آپ کا بہانہ وہ بعض ضعیف روایات ہیں جو ہماری کتابوں میں نقل ہوئی ہیں تو اس قسم کی ضعیف روایات آپ کی حدیث و تفسیر کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ جنکی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔

کوئی بھی مذہب ضعیف روایات کی بنا پر استوار نہیں ہوتا ہے۔

اور ہم نے کبھی بھی ابن الخطیب مصری کی کتاب (الفرقان فی تحریف القرآن) کی خاطر یا آپ کی ان ضعیف روایات کی خاطر جو تحریف قرآن پر مشتمل ہیں آپ پر تحریف قرآن کی تہمت نہیں لگائی۔ اور ہم کبھی بھی قرآن مجید کو تخریب کاری کرنے والے تعصب کا شکار نہیں ہونے دیں گے۔

دن رات تحریف قرآن کی باتیں نہ کیجئے۔ اسلام، مسلمین اور قرآن مجید پر ظلم نہ کیجئے اور اپنے مذہبی تعصب کی وجہ سے بار بار تحریف قرآن کی رٹ لگا کر پوری دنیا کے مسلمانوں کے اصلی سرمائے یعنی قرآن مجید کے اعتبار کو کم نہ کیجئے۔ دشمن کو بہانہ فراہم نہ کیجئے۔ تم اگر اس طریقے سے شیعوں اور اہل بیت کے پیروکاروں سے انتقام لینا چاہتے ہو تو جان لو تم جہالت

اور نادانی سے اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہو۔ کیونکہ تم کہتے ہو کہ مسلمانوں کا ایک عظیم گروہ تحریف قرآن کا قائل ہے اور یہ قرآن مجید پر ظلم عظیم ہے۔

آخر میں پھر ایک دفعہ صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ شیعہ اور اہل سنت کا کوئی محقق بھی تحریف قرآن کا قائل نہیں ہے بلکہ سب علماء اس قرآن مجید کو جو پیغمبر اکرم پر نازل ہوا اور جو آج مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے ایک ہی سمجھتے ہیں۔ اور خود قرآن مجید کی تصریح کے مطابق عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہے اور ہر قسم کی تحریف، تبدیلی اور زوال سے اسے محفوظ رکھنے کی ضمانت دی ہے۔

لیکن دونوں طرف سے بعض بے خبر، ناآگاہ متعصب قسم کے لوگ، ایک دوسرے کی طرف تحریف کی نسبت دیتے ہیں اور اس مسئلے کو اختلاف کے عروج تک پہنچا دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو ہدایت فرمائے۔ (آمین)

۲

"تقیہ"

قرآن و سنت کے آئینہ میں

دوسرا مسئلہ جس پر ہمیشہ ہمارے متعصب مخالفین اور بہانہ تلاش کرنے والے افراد، مکتب اہلبیت کے پیروکاروں پر تشنیع کرتے ہیں، "تقیہ" کا مسئلہ ہے۔

وہ کہتے ہیں تم کیوں تقیہ کرتے ہو؟ کیا تقیہ ایک قسم کا نفاق نہیں ہے؟!

یہ لوگ اس مسئلہ کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں کہ گویا تقیہ کوئی حرام کام یا گناہ کبیرہ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کوئی گناہ ہے۔ یہ لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ قرآن مجید نے متعدد آیات میں تقیہ کو مخصوص شرائط کے ساتھ جائز شمار کیا ہے۔ اور خود ان کے اپنے مصادر میں منقول روایات اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر تقیہ (اپنی مخصوص شرائط کے ساتھ) ایک واضح عقلی فیصلہ ہے۔ خود ان کے بہت سے لوگوں نے اپنی ذاتی زندگی میں اس کا تجربہ کیا ہے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

اس بات کی وضاحت کے لیے چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

ا۔ تقیہ کیا ہے؟

تقیہ یہ ہے کہ انسان اپنے مذہبی عقیدہ کو شدید اور متعصب مخالفین کے سامنے کہ جو اس کے لئے خطرہ ایجاد کر سکتے ہوں چھپا لے۔ مثال کے طور پر اگر ایک موحد مسلمان، بہت سے ہٹ دھرم بت پرستوں کے چنگل میں پھنس جائے، اب اگر وہ اسلام اور توحید کا اظہار کرتا ہے تو وہ اس کا خون بہا دیں گے یا وہ اسے جان، مال یا ناموس کے اعتبار سے شدید نقصان پہنچائیں گے۔ اس

حالت میں مسلمان اپنے عقیدہ کو ان سے پنہاں کر لیتا ہے تا کہ انکے گزند سے امان میں رہے
یا مثلاً، اگر ایک شیعہ مسلمان کسی بیابان میں ایک ہٹ دھرم وہابی کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے
جو شیعوں کا خون بہانا مباح سمجھتا ہے۔ اس حالت میں وہ مومن اگر اپنی جان، مال اور ناموس
کی حفاظت کے لئے اُس وہابی سے اپنا عقیدہ چھپا لیتا ہے تو ہر عاقل اس بات کی تصدیق کرتا
ہے کہ ایسی حالت میں یہ کام مکمل طور پر منطقی ہے اور عقل بھی یہاں یہی حکم لگاتی ہے۔ کیونکہ
خواہ مخواہ اپنی جان کو متعصب لوگوں کی نذر نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ تقیہ اور نفاق کا فرق:

نفاق بالکل تقیہ کے مقابلے میں ہے۔ منافق وہ ہوتا ہے جو باطن میں اسلامی قوانین پر
عقیدہ نہ رکھتا ہو یا انکے بارے میں شک رکھتا ہو لیکن مسلمانوں کے درمیان اسلام کا اظہار کرتا
ہو۔

جس تقیہ کے ہم قائل ہیں وہ یہ ہے کہ انسان باطن میں صحیح اسلامی عقیدہ رکھتا ہو، البتہ
صرف ان شدت پسند وہابیوں کا پیروکار نہیں ہے جو اپنے علاوہ تمام مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں
اور انکے لیے کفر کا خط کھینچ دیتے ہیں اور انہیں دھمکیاں دیتے ہیں۔ جب بھی ایسا باایمان شخص
اپنی جان، مال یا ناموس کی حفاظت کے لئے اس متعصب ٹولے سے اپنا عقیدہ چھپائے اس کو
تقیہ کہتے ہیں اور اسکے مقابل والا نکتہ نفاق ہے۔

۳۔ تقیہ عقل کے ترازو میں:

تقیہ حقیقت میں ایک دفاعی ڈھال ہے۔ اسی لیے ہماری روایات میں اسے (ترس

المومن) یعنی (باایمان لوگوں کی ڈھال) کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ کسی انسان کی عقل
اجازت نہیں دیتی کہ انسان اپنے باطنی عقیدہ کا خطرناک اور غیر منطقی افراد کے سامنے اظہار
کرے اور خواہ مخواہ اپنی جان، مال یا ناموس کو خطرے میں ڈالے۔ کیونکہ بلاوجہ طاقت
اور وسائل کو ضائع کرنا کوئی عقلی کام نہیں ہے۔

تقیہ اس طریقہ کار کے مشابہ ہے جسے تمام فوجی میدان جنگ میں استعمال کرتے ہیں
اپنے آپ کو درختوں، سرنگوں اور ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپا لیتے ہیں اور اپنا لباس درختوں
کی شاخوں کے رنگ جیسا انتخاب کرتے ہیں تا کہ بلاوجہ ان کا خون ہدر نہ جائے۔

دنیا کے تمام عقلا اپنی جان کی حفاظت کے لیے سخت دشمن کے مقابلے میں تقیہ والی روش
سے استفادہ کرتے ہیں۔ کبھی بھی عقلاء، کسی کو اس طریقہ اپنانے پر سرزنش نہیں
کریں گے۔ آپ دنیا میں ایک انسان بھی ایسا نہیں ڈھونڈ سکتے جو تقیہ کو اس کی شرائط کے
ساتھ قبول نہ کرتا ہو۔

۴۔ تقیہ کتاب الٰہی میں:

قرآن مجید نے متعدد آیات میں تقیہ کو کفار اور مخالفین کے مقابلہ میں جائز قرار دیا ہے۔
مثال کے طور پر چند آیات پیش خدمت ہیں۔

(الف) آل فرعون کے مؤمن کی داستان میں یوں بیان ہوا ہے۔

(وقال رجل مومن من آل فرعون یکتم ایمانہ
اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ وقد جاءکم

بالبینات ......)(۱)

آل فرعون میں سے ایک باایمان مرد نے کہ جو (موسیٰ کی شریعت پر) اپنے ایمان کو چھپاتا تھا کہا: کیا تم ایسے مرد کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار خدا ہے اور وہ اپنے ساتھ واضح معجزات اور روشن دلائل رکھتا ہے۔

پھر مزید مومن کہتا ہے (اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اگر جھوٹ کہتا ہے تو اس جھوٹ کا اثر اس کے دامن گیر ہوگا اور اگر سچ کہتا ہے تو ممکن ہے بعض عذاب کی جو دھمکیاں اس نے سنائی ہیں وہ تمہارے دامن گیر ہو جائیں) پس اس طریقے سے آل فرعون کے اس مومن نے تقیہ کی حالت میں (یعنی اپنے ایمان کو مخفی رکھتے ہوئے) اس ہٹ دھرم اور متعصب ٹولے کو کہ جو حضرت موسیٰ کے قتل کے درپے تھی ضروری نصیحتیں کر دیں۔

ب) قرآن مجید کے ایک دوسرے مرحلہ فرمان میں ہم یوں پڑھتے ہیں۔

(لایتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین ومن یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شیء الا ان تتقوا منھم تقاۃ......) (۲)

مومنین کو نہیں چاہیے کہ کفار کو اپنا دوست بنائیں۔ جو بھی ایسا کرے گا وہ خدا سے بیگانہ ہے ہاں مگر یہ کہ تقیہ کے طور پر ایسا کیا جائے۔

اس آیت میں دشمنان حق کی دوستی سے مکمل طور پر منع کیا گیا ہے مگر اس صورت میں اجازت ہے کہ جب ان کے ساتھ اظہار دوستی نہ کرنا مسلمان کی آزار و اذیت کا سبب بنے، اس وقت ایک دفاعی ڈھال کے طور پر ان کی دوستی سے تقیہ کی صورت میں فائدہ اٹھایا جائے۔

۱) سورۂ غافر آیت ۲۸۔

۲) سورۂ آل عمران آیت ۲۸۔

ج) جناب عمارؓ یاسر اور انکے ماں، باپ کی داستان کو تمام مفسرین نے نقل کیا ہے۔ یہ تینوں اشخاص مشرکین عرب کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔ وہ مشرکین نے انہیں پیغمبر اکرمؐ سے اظہار برات کرنے کو کہا۔ جناب عمارؓ کے والدین نے علان لاتعلقی سے انکار کیا جس کے نتیجے میں وہ شہید ہو گئے۔ لیکن جناب عمار نے تقیہ کرتے ہوئے انکی مرضی کی بات کہہ دی۔ اور اس کے بعد جب گریہ کرتے ہوئے پیغمبر اکرم کی خدمت میں آئے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

(من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان......)(۱)

جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائیں ۔ انکے لئے شدید عذاب ہے مگر وہ لوگ جنہیں مجبور کیا جائے۔

پیغمبر اکرمؐ نے جناب عمار کے والدین کو شہداء میں شمار کیا اور جناب عمار یاسر کی آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور فرمایا تجھ پر کوئی گناہ نہیں ہے اگر پھر مشرکین تمہیں مجبور کریں تو انہی کلمات کا تکرار کرنا۔ تمام مسلمان مفسرین کا اس آیت کی شان نزول کے بارے میں اتفاق ہے کہ یہ آیت جناب عمار یاسر اور انکے والدین کے بارے میں نازل ہوئی اور بعد میں رسول خدا نے یہ جملات بھی ادا فرمائے۔ تو اس اتفاق سے عیاں ہو جاتا ہے کہ سب مسلمان تقیہ کے جواز کے قائل ہیں۔ ہاں یہ بات باعث تعجب ہے کہ قرآن مجید سے اتنی محکم ادلہ اور اہل سنت مفسرین کے اقوال کے باوجود شیعہ کو تقیہ کی خاطر مورد طعن قرار دیا جاتا ہے۔

۱) سورۂ نحل آیت ۱۰۶۔

جی ہاں نہ تو جناب عمار منافق تھے نہ ہی آل فرعون کا وہ مومن منافق تھا بلکہ تقیہ کے دستور الٰہی سے انہوں نے فائدہ اٹھایا۔

۵۔ تقیہ اسلامی روایات میں:

اسلامی روایات میں بھی تقیہ کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مسند ابی شیبہ اہل سنت کی معروف مسند ہے۔ اس میں (مسیلمہ کذاب) کی داستان میں نقل ہوا ہے کہ مسیلمہ کذاب نے رسول خداؐ کے دو اصحاب کو اپنے اثر ورسوخ والے علاقے میں گرفتار کرلیا اور دونوں سے سوال کیا کہ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں خدا کا نمائندہ ہوں؟' ایک نے گواہی دے کر اپنی جان بچائی اور دوسرے نے گواہی نہیں دی تو اس کی گردن اڑادی گئی۔ جب یہ خبر رسول خداؐ تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا جو قتل ہوگیا اس نے صداقت کے راستے پر قدم اٹھایا اور دوسرے نے رخصت الٰہی کو قبول کرلیا اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہے(۱)

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں بھی بالخصوص ان ائمہ کے کلمات میں کہ جو بنو عباس اور بنو امیہ کی حکومت کے زمانہ میں زندگی بسر کرتے تھے اور اس دور میں جہاں کہیں محب علیؑ ملتا اسے قتل کردیا جاتا تھا۔ تقیہ کا حکم کثرت سے ملتا ہے۔ کیونکہ وہ مامور تھے کہ ظالم اور بے رحم دشمنوں سے اپنی جان بچانے کے لئے تقیہ کی ڈھال سے استفادہ کریں۔

۶۔ کیا تقیہ صرف کفار کے مقابلے میں ہے؟

ہمارے بعض مخالفین جب ان واضح آیات اور مندرجہ بالا روایات کا سامنا کرتے ہیں تو اسلام میں تقیہ کے جواز کو قبول کرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا اس وقت وہ

۱) مسند ابی شیبہ، ج ۱۲، ص ۳۵۸۔

یوں راہ فرار تلاش کرتے ہیں کہ تقیہ تو صرف کفار کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں تقیہ جائز نہیں ہے۔ حالانکہ مندرجہ بالا ادلہ کی روشنی میں بالکل واضح ہے کہ ان دو موارد میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اگر تقیہ کا مفہوم متعصب اور خطرناک افراد کے مقابلے میں اپنی جان، مال اور ناموس کی حفاظت کرنا ہے، اور حقیقت میں بھی یونہی ہے، تو پھر نا آگاہ اور متعصب مسلمان اور کافر کے درمیان کیا فرق ہے؟ اگر عقل وخرد یہ حکم لگاتی ہے کہ ان امور کی حفاظت ضروری ہے اور انہیں بیہودہ طور پر ضائع کرنا مناسب نہیں ہے تو پھر ان دو مقامات میں کیا فرق ہے۔

دنیا میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو انتہائی جہالت اور غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے کہتے ہیں کہ شیعہ کا خون بہانا قربت الٰہی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اب اگر کوئی مخلص شیعہ جو امیر المومنین علیہ السلام کا حقیقی پیروکار ہو اور اس جماعت کارٹولے کے ہاتھوں گرفتار ہوجائے اور وہ اس سے پوچھیں کہ بتا تیرا مذہب کیا ہے؟ اب گر یہ مخلص واضح بتادے کہ میں شیعہ ہوں تو یہ خواہ مخواہ اپنی گردن کو جہالت کی تلوار کے سپرد کرنے کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟ کوئی بھی صاحب عقل وخرد یہ حکم لگا سکتا ہے؟

بالفاظ دیگر جو کام مشرکین عرب نے جناب عمار و یاسر یا مسیلمہ کذاب کے پیروکاروں نے دو اصحاب رسول خدا کے ساتھ کیا اگر وہی کام بنو امیہ اور بنو عباس کے خلفاء اور جاہل مسلمان، شیعوں کے ساتھ انجام دیں تو کیا ہم تقیہ کو حرام کہیں اور اہل بیت علیہم السلام کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مخلص پیروکاروں کی نابودی کے اسباب فراہم کریں صرف اس خاطر کہ یہ حاکم بظاہر مسلمان تھے؟!!

اگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام تقیہ کے مسئلہ پر بہت زیادہ تاکید نہ کرتے یہاں تک کہ فرمایا ہے

(تسعة اعشار الدين التقيه) دس میں سے نو حصے دین تقیہ ہے۔(۱)

تو بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں شیعوں کے مقتولین کی تعداد شاید لاکھوں بلکہ کروڑوں تک پہنچ جاتی۔ یعنی انکی بے رحمانہ اور وحشیانہ قتل وغارت دسیوں گنا زیادہ ہو جاتی۔

آیا ان شرائط میں تقیہ کی مشروعیت کے بارے میں ذرہ برابر شک رہ جاتا ہے؟ ہم یہ بات فراموش نہیں کر سکتے کہ جب اہل سنت بھی سالہا سال مذہبی اختلافات کی خاطر ایک دوسرے سے تقیہ کرتے تھے۔ من جملہ قرآن مجید کے حادث یا قدیم ہونے پر انکا شدید اختلاف تھا اور اس راہ میں بہت ساروں کا خون بہہ گیا! (وہی نزاع کہ جو آج محققین کی نظر میں بالکل بیہودہ اور بے معنی نزاع ہے) کیا جو گروہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا تھا اگر ان میں سے کوئی شخص مخالفین کے چنگل میں گرفتار ہو جاتا تو کیا اسے صراحت کے ساتھ کہہ دینا چاہیے کہ میرا یہ عقیدہ ہے چاہے اس کا خون بہہ جائے اور اس کے خون بہنے کا نہ کوئی فائدہ ہو اور نہ کوئی تاثیر؟!

۲۔ جناب فخر رازی اس آیت (الا ان تتقوا منهم تقاة) (۲) کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ آیت کا ظہور یہ ہے کہ تقیہ غالب کافروں کے مقابلے میں جائز ہے (الا ان مذهب الشافعي رض. ان الحالة بين المسلمين اذا شاكلت الحالة بين المسلمين والمشركين حلت التقيه محاماة على النفس) لیکن مذہب شافعی یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی کیفیت بھی ایک دوسرے کے ساتھ مسلمین وکفار جیسی ہو جائے تو اپنی جان کی حفاظت کے لئے تقیہ جائز ہے۔

۱) بحار الانوار جلد ۱۰۹ ص ۲۵۴۔

۲) سورۃ آل عمران آیہ ۲۸۔

اس کے بعد حفظ مال کی خاطر تقیہ کے جواز پر دلیل پیش کرتے ہیں کہ حدیث نبوی ہے (حرمة مال المسلم كحرمة دمه) مسلمان کے مال کا احترام اس کے خون کی مانند ہے) اور اسی طرح دوسری حدیث میں ہے (من قتل دون ماله فهو شهيد) جو اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے(۱)۔

تفسیر نیشاپوری میں کہ جو تفسیر طبری کے حاشیہ پر لکھی گئی ہے یوں بیان کیا گیا ہے کہ قال الامام الشافعی

(تجوز التقيه بين المسلمين كما تجوز بين الكافرين محاماة عن النفس) (۲)

امام شافعی فرماتے ہیں کہ جان کی حفاظت کی خاطر مسلمانوں سے تقیہ کرنا بھی جائز ہے۔ جس طرح کفار سے تقیہ کرنا جائز ہے۔

۳۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بنی عباس کی خلافت کے دور میں بعض اہل سنت محدثین (قرآن مجید کے قدیم ہونے) پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے بنو عباس کے حکام کی طرف سے دباؤ کا شکار ہوئے انہوں نے تقیہ کرتے ہوئے اعتراف کر لیا کہ قرآن مجید حادث ہے اور اس طرح انہوں نے اپنی جان بچالی۔

"ابن سعد" مشہور مورخ کتاب طبقات میں اور طبری ایک اور مشہور مورخ اپنی تاریخ کی کتاب میں دو خطوط کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جو مامون کی طرف سے اسی مسئلہ کے بارے میں بغداد کے پولیس افسر (اسحٰق بن ابراہیم) کی طرف ارسال کیے گئے۔

۱) تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۸ ص ۱۳۔

۲) تفسیر نیشاپوری (تفسیر طبری کے حاشیہ پر) جلد ۳ ص ۱۱۸۔

پہلے خط کے بارے میں ابن سعد یوں لکھتا ہے کہ مامون نے پولیس افسر کو لکھا کہ سات مشہور محدثین (محمد بن سعد کاتب واقدی۔ ابو مسلم۔ یحیی بن معین۔ زہیر بن حرب۔ اسمٰعیل بن داؤد۔ اسمٰعیل بن ابی مسعود۔ و احمد بن الدورقی) کو حفاظتی اقدامات کے ساتھ میری طرف بھیج دو۔ جب یہ افراد مامون کے پاس پہنچے تو اس نے ان سے آزمانے کے لیے سوال کیا کہ قرآن مجید کے بارے میں تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ تو سب نے جواب دیا کہ قرآن مجید مخلوق ہے (حالانکہ اس وقت محدثین کے درمیان مشہور نظریہ اس کے برعکس تھا یعنی قرآن مجید کے قدیم ہونے کے قائل تھے اور ان محدثین کا بھی یہی عقیدہ تھا(۱) ہاں انہوں نے مامون کی سخت سزاؤں کے خوف سے تقیہ کیا اور قرآن مجید کے مخلوق ہونے کا اعتراف کر لیا اور اپنی جان بچا لی۔ مامون کے دوسرے خط کے بارے میں کہ جسے طبری نے نقل کیا ہے اور وہ بھی بغداد کے پولیس افسر کے نام تھا یوں پڑھتے ہیں کہ جب مامون کا خط اس کے پاس پہنچا تو اس نے بعض محدثین کو کہ جنکی تعداد شاید ۲۶ چھبیس افراد تھی حاضر کیا اور مامون کا خط انکے سامنے پڑھا۔ پھر ہر ایک کو الگ الگ پکار کر قرآن مجید کے بارے میں انکا عقیدہ معلوم کیا۔ ان میں سوائے چار افراد کے سب نے اعتراف کیا کہ قرآن مجید مخلوق ہے (اور تقیہ کر کے اپنی جان بچالی) جن چار افراد نے اعتراف نہیں کیا انکے نام یہ تھے احمد ابن حنبل، سجادہ، القواریری، اور محمد بن نوح۔ پولیس انسپکٹر نے حکم دیا کہ انہیں زنجیروں میں جکڑ کر زندان میں ڈال دیا جائے۔ دوسرے دن دوبارہ ان چاروں افراد کو بلایا اور قرآن مجید کے بارے میں اپنے سوال کا تکرار کیا۔ سجادہ نے اعتراف کر لیا کہ قرآن مجید مخلوق ہے وہ آزاد ہو

۱) طبقات ابن سعد جلد ۷ ص ۱۶۷ چاپ بیروت۔

گیا۔ باقی تین نے مخالفت پر اصرار کیا، انہیں دوبارہ زندان بھیج دیا گیا۔ اگلے دن پھر ان تین افراد کو بلایا گیا اس مرتبہ (القواریری) نے اپنا بیان واپس لے لیا اور آزاد ہو گیا۔ لیکن احمد ابن حنبل اور محمد بن نوح اسی طرح اپنے عقیدہ پر مصر رہے۔ پولیس انسپکٹر نے انہیں (طرطوس) (۱) شہر میں جلا وطن کر دیا۔

جب کچھ لوگوں نے ان تقیہ کرنے والوں پر اعتراض کیا تو انہوں نے کفار کے مقابلے میں جناب عمار یاسر کے عمل کو دلیل کے طور پر پیش کیا (۲) ان موارد سے بالکل روشن ہو جاتا ہے کہ جس وقت انسان کسی چنگل میں گرفتار ہو جائے اور اس وقت ظالموں سے نجات پانے کا تنہا راستہ تقیہ ہو تو وہ یہ راستہ اختیار کر سکتا ہے خواہ یہ تقیہ کافر کے مقابلہ میں ہو یا مسلمان کے مقابلے میں ہو۔

۷) حرام تقیہ:

بعض موارد میں تقیہ حرام ہے اور یہ اس وقت ہے کہ جب ایک فرد یا گروہ کے تقیہ کرنے اور اپنا مذہبی عقیدہ چھپانے سے اسلام کی بنیاد کو خطرہ لاحق ہوتا ہو یا مسلمانوں کو شدید نقصان ہوتا ہو۔ اس وقت اپنے حقیقی عقیدہ کو ظاہر کرنا چاہیے، چاہے جان کے لئے خطرے کا باعث ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اور قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ اس سے منع فرمایا ہے (ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ) یہ

۱) طرطوس بحیرہ روم کے کنارے ایک شہر ہے (معجم البلدان جلد ۴ ص ۳۰)۔
۲) تاریخ طبری جلد ۷ ص ۱۹۵۔

لوگ سخت خطرہ سے دوچار ہیں کیونکہ اس کا لازمہ یہ ہے کہ میدان جہاد میں حاضر ہونا بھی حرام ہوجائے جبکہ کوئی بھی عاقل ایسی بات نہیں کرتا ہے۔ یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ یزید کے مقابلے میں امام حسین علیہ السلام کا قیام یقیناً ایک دینی فریضہ تھا۔ اسی لئے امام علیہ السلام تقیہ کے طور پر بھی یزیدیوں اور بنو امیہ کے غاصب خلفاء کے ساتھ کسی قسم کی نرمی دکھانے پر راضی نہ ہوئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا کرنے سے اسلام کی بنیاد کو شدید دھچکا لگے گا۔ آپ کا قیام اور آپکی شہادت مسلمانوں کی بیداری اور اسلام کو جاہلیت کے چنگل سے نجات دلانے کا باعث بنی۔

(مصلحت آمیز) تقیہ: یہ تقیہ کی ایک دوسری قسم ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ایک مذہب والے، مسلمانوں کی صفوں میں وحدت برقرار رکھنے کے لئے ان باتوں میں جن سے دین و مذہب کی بنیاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، دوسرے تمام فرقوں کے ساتھ ہماہنگی اور یکجہتی کا ثبوت دیتے ہیں۔ مثلاً مکتب اہل بیت علیہم السلام کے پیروکار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کپڑے اور قالین پر سجدہ نہیں ہوتا اور پتھر یا مٹی وغیرہ پر سجدہ کرنا ضروری ہے۔ اور پیغمبر اکرم کی اس مشہور حدیث (جعلت لی الارض مسجداً و طهورا) (۱) "زمین کو میرے لئے محل سجدہ اور وسیلہ تیمم قرار دیا گیا ہے" کو اپنی دلیل قرار دیتے ہیں اب اگر وہ وحدت برقرار رکھنے کیلئے دیگر مسلمانوں کی صفوں میں انکی مساجد میں یا مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں جب نماز پڑھتے ہیں تو نا گزیر کپڑے پر سجدہ کرتے ہیں۔ یہ کام جائز ہے اور ایسی نماز ہمارے عقیدہ کے مطابق

۱) صحیح بخاری جلد ۱ ص ۹۱ و سنن بیہقی جلد ۲ ص ۴۳۳ (اور بھی بہت سی کتب میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے)۔

درست ہے اور اسے عام مدارا کرنے والا (مصلحت آمیز) تقیہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں جان و مال کا خوف و ڈر کار نہیں ہے بلکہ اس میں تمام اسلامی فرقوں کے ساتھ مدارا کرنے اور حسن معاشرت کا عنوان درپیش ہے۔ تقیہ کی بحث کا ایک بزرگ عالم دین کے کلام کے ساتھ اختتام کرتے ہیں۔

ایک شیعہ عالم دین کی مصر میں الازہر کے ایک بزرگ استاد سے ملاقات ہوئی اس نے شیعہ عالم کو سرزنش کرتے ہوئے کہا میں نے سنا ہے تم لوگ تقیہ کرتے ہو؟ شیعہ عالم دین نے جواب میں کہا (لعن الله من حملنا علی التقية) رحمت الٰہی سے دور ہوں وہ لوگ جنہوں نے ہمیں تقیہ پر مجبور کیا! (۱)

۱) یعنی اگر دشمنوں کی طرف سے ہماری جان و مال کو خطرہ نہ ہوتا تو ہم کبھی بھی تقیہ نہ کرتے (مترجم)

۳

عدالت صحابه

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب خصوصی امتیازات سے بہرہ مند تھے۔ وحی الہی اور آیات کو پیغمبر اکرمؐ کی زبان مبارک سے سنتے تھے۔ آنحضرتؐ کے معجزات کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اور آپ کی قیمتی باتوں کے ذریعے پرورش پاتے تھے آنحضرتؐ کے عملی نمونوں اور اسوہ حسنہ سے بہرہ مند تھے۔

اسی وجہ سے انکے درمیان ایسی بزرگ اور ممتاز شخصیات نے تربیت پائی کہ جہان اسلام جنکے وجود پر فخر و مباہات کرتا ہے۔ لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیا تمام اصحاب بغیر کسی استثناء کے مومن صالح، سچے، درستکار اور عادل افراد تھے یا ان کے درمیان غیر صالح افراد بھی موجود تھے۔

اہ دو متضاد عقیدے:

صحابہ کے بارے میں دو مختلف عقیدے موجود ہیں پہلا عقیدہ یہ کہ تمام صحاب بغیر کسی استثناء کے پاکیزگی و طہارت کے نور سے منور ہیں اور سب ہی صالح، عادل، باتقوی اور صادق تھے۔ اسی وجہ سے ان میں سے جو بھی پیغمبر اکرمؐ سے حدیث نقل کرے صحیح اور قابل قبول ہے۔ اور ان پر کوئی چھوٹا سا اعتراض بھی نہیں کیا جاسکتا ہے اور اگر ان سے غلط کام سرزد ہو جائے تو ان کی توجیہ کرنا چاہیئے۔ یہ اہل سنت کے اکثر گروہوں کا عقیدہ ہے۔

دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ اگرچہ ان کے درمیان باشخصیت، فداکار، پاک اور باتقویٰ افراد موجود تھے لیکن منافق اور غیر صالح افراد بھی موجود تھے۔ اور قرآن مجید اور پیغمبر اکرمؐ نے ان سے اظہار بیزاری کیا ہے۔

بالفاظ دیگر اچھے اور برے کی تشخیص کا جو معیار ہر جگہ استعمال ہوتا ہے وہی معیار ہم یہاں بھی جاری کریں گے۔ ہاں چونکہ یہ پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب تھے اس لئے ان کے بارے میں ہمارا اصلی و بنیادی نظریہ یہ ہوگا کہ یہ نیک و پاک افراد ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم حقائق سے ہرگز چشم پوشی نہیں کریں گے۔ اور عدالت و صدق سے منافی اعمال کے صدور پر نقص بھر نہیں کریں گے۔ چونکہ یہ کام، اسلام اور مسلمین پر ایک کاری ضرب لگاتا ہے اور اسلام کی چار دیواری میں منافقین کے داخل کا سبب بنتا ہے۔

مذہب شیعہ اور اہلسنت کے روشن فکر علماء کے ایک گروہ نے اس عقیدہ کا انتخاب کیا ہے۔

۲۔ تنزیہ کے سلسلہ میں شدت پسندی:

تنزیہ صحابہ والے نظریہ کے طرفداروں کے ایک گروہ نے اتنی شدت اختیار کی ہے کہ جو بھی اصحاب پر تنقید کرے اسے فاسق اور کبھی ملحد اور زندیق شمار کرتا ہے اور یا اس کا خون بہا مباح سمجھتا ہے۔

من جملہ ابوزرعہ رازی کی کتاب "الاصابہ" میں یوں ملتا ہے "اگر دیکھو کوئی شخص اصحاب پیغمبرؐ میں سے کسی پر تنقید کر رہا ہے تو جان لو کہ وہ زندیق ہے۔ یہ قول اس لئے ہے کہ چونکہ رسول خداؐ حق اور قرآن حق ہے اور جو کچھ پیغمبر پر نازل ہوا حق ہے اور ان تمام چیزوں کو

صحابہ نے ہم تک پہنچایا ہے اور یہ (مخالفین) چاہتے ہیں ہمارے شہود (گواہوں) کو بے اعتبار کریں تاکہ کتاب و سنت ہاتھ سے چلی جائے!"(۱)

"عبداللہ موصلی" اپنی کتاب "حتیٰ لا نخدع" میں یوں رقمطراز ہیں "یہ اصحاب ایسا گروہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی ہمنشینی اور دین و شریعت کے قوام کے لیے چنا ہے۔ اور انہیں پیغمبرؐ کا وزیر قرار دیا ہے۔ انکی محبت کو دین و ایمان اور انکے بغض کو کفر و نفاق شمار کیا ہے! اور امت پر واجب کیا ہے کہ ان سب کو دوست رکھیں اور ہمیشہ انکی خوبیاں اور فضائل بیان کریں اور انکی آپس میں جو جنگیں اور جھگڑے ہوئے ہیں ان پر خاموشی اختیار کریں!"(۲)

عنقریب روشن ہو جائیگا کہ یہ بات قرآن و سنت کے خلاف ہے۔

۳۔ لاجواب سوالات:

ہر عقلمند اور منصف مزاج انسان جو ہر بات کو بغیر دلیل اور آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کرتا اپنے آپ سے یہ سوالات کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ازواج پیغمبرؐ کے بارے میں یوں فرماتا ہے کہ:

"یٰنِسَاءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا"(۳)

---

۱) [illegible]

۲) حتیٰ لا نخدع [illegible]

۳) سورۂ احزاب آیت ۳۰۔

اے ازواج رسول تم میں سے جس نے بھی کھلم کھلا گناہ کیا اس کی سزا دو برابر ہوگی اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے۔

ہم صحابہ کی جو بھی تفسیر کریں (عنقریب اصحاب کی مختلف تعریفیں بیان ہوں گی) بلاشبہ ازواج نبیؐ اصحاب کا روشن ترین مصداق ہیں۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان کے گناہوں سے چشم پوشی نہیں کی جائے گی بلکہ ان کی سزا دو برابر ہوگی۔

کیا ہم اس آیت پر یا نظریہ تنزیہ کے طرفداروں کی بلاشرط حمایت پر یقین رکھیں؟

نیز قرآن مجید شیخ الانبیاء حضرت نوحؑ کے فرزند کے بارے میں اس کی غلطیوں کی وجہ سے یوں فرماتا ہے " انه عمل غير صالح " وہ غیر صالح عمل ہے۔(۱)

اور جناب نوحؑ کو خبردار کیا گیا کہ اس کی شفاعت نہ کریں!

کیا ایک نبی کا فرزند اہم ہوتا ہے یا اس کے اصحاب و اعوان؟

حضرت نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویوں کے بارے میں قرآن مجید یوں کہتا ہے:

" فخانتاهما فلم يغنيا عنهما من الله شيئا وقيل ادخلا النار مع الداخلين "(۲)

ان دو نے اپنے شوہروں (نوح اور لوط) کے ساتھ خیانت کی (اور دشمنوں کا ساتھ دیا) اور وہ دو پیغمبر ان کی شفاعت نہ کر سکے اور ان دونوں کو حکم دیا گیا کہ دوزخیوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ۔

۱) سورۃ ہود آیت ۴۶۔

۲) سورۃ تحریم آیت ۱۰۔

کیا یہ آیات صراحت کے ساتھ بیان نہیں کر رہیں کہ افراد کی خوبی و بدی کا معیار ان کا اپنا ایمان اور عمل ہے۔ حتیٰ کہ اگر برے اعمال ہوں تو نبی کی بیوی یا بیٹا ہونا بھی جہنم میں جانے سے نہیں روک سکتا۔

اس کے باوجود کیا صحیح ہے کہ ہم آنکھیں بند کر لیں اور کہیں کہ فلاں شخص چونکہ کچھ مدت کے لیے نبی کا صحابی رہا ہے لہذا اس کی محبت دین و ایمان اور اس کی مخالفت کفر و نفاق ہے۔ چاہے وہ صحابی بعد میں منافقین کی صف میں داخل ہو گیا ہو اور اس نے نبی اکرمؐ کا دل دکھایا ہو اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہو۔ کیا عقل و خرد اس بات کو قبول کرتی ہے؟

اگر کوئی کہے کہ طلحہ و زبیر ابتدائے اسلام میں اچھے انسان تھے لیکن جس وقت حکومت کی ہوس ان پر سوار ہوئی تو انہوں نے زوجہ رسولؐ (حضرت عائشہ) کو اپنے ساتھ لیا اور حضرت علیؑ کے ساتھ اپنی بیعت و پیمان توڑ دی حالانکہ تقریباً تمام مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ پھر انہوں نے جنگ جمل کی آتش کو بھڑکایا اور اس طرح سترہ ہزار مسلمان اس جنگ کا لقمہ بن گئے۔ پس یہ لوگ راہ راست سے منحرف ہو گئے تھے اور اس عظیم تعداد کا خون ان کی گردن پر ہے اور قیامت کے دن یہ جوابدہ ہوں گے۔

کیا یہ بات حقیقت کے خلاف ہے؟!

یا اگر کوئی کہے کہ چونکہ معاویہ نے حضرت علیؑ کی بیعت کی خلاف ورزی کی اور جس خلافت کو تمام مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا تو اس نے انکار کیا اور جنگ صفین کی آگ بھڑکائی جس میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان لقمہ اجل بن گئے۔ لہذا معاویہ ستمگر آدمی تھا۔ کیا یہ بات ناحق ہے؟!

کیا تاریخ کے ان تلخ حقائق سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ یا ان غلط توجیہات کی خاطر جنہیں کوئی بھی عقلمند آدمی قبول نہیں کرتا ان نہایت افسوس ناک حوادث سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے؟ کیا "عبداللہ موصلی" کے بقول ایسے افراد کی محبت، دین و ایمان ہے اور ان سے بغض کفر و نفاق ہے؟!

کیا ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ان غلط کاموں کے سامنے جو ہزاروں مسلمانوں کے قتل کے موجب بنے ہیں سکوت اختیار کریں؟ کونسی عقل یہ حکم لگاتی ہے؟ قرآن مجید کہتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے گرد جمع ہونے والوں میں منافق لوگ بھی تھے کیا ان آیات قرآن سے چشم پوشی کر لیں؟

قرآن مجید یوں فرماتا ہے:

"وممن حولكم من الأعراب منافقون و من أهل المدينة مردوا على النفاق لا تعلمهم نحن نعلمهم ..."(۱)

کیا آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس قسم کی منطق کو دنیا کے عقلمند انسان قبول کر لیں؟

۴: صحابہ کون ہیں؟

اس مقام پر ایک اور اہم نکتہ مفہوم "صحابہ" ہے۔

صحابہ کہ جن کے بارے میں طہارت و پاکیزگی کی بات کی جاتی ہے تو مسئلہ یہ ہے کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس سلسلہ میں علمائے اہل سنت کی جانب سے مختلف طور پر تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔

۱) سورۂ توبہ آیت ۱۰۱۔

۱۔ بعض نے تو اس کے مفہوم کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے جس نے بھی آنحضرتؐ کو دیکھا ہے وہ آپ کا صحابی ہے!

اسی چیز کو بخاری نے ذکر کیا ہے وہ یوں لکھتے ہیں: "من صحب رسول الله او رآه من المسلمين فهو من اصحابه!"

اہل سنت کے معروف عالم جناب احمد بن حنبل نے بھی صحابی کے مفہوم کو بہت وسیع بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں: "اصحاب رسول الله كل من صحبه، شهرا او يوما او ساعة او رآه"

"رسول خدا کا صحابی وہ ہے کہ جس نے رسول خدا کی صحبت اختیار کی ہو چاہے ایک ماہ، ایک دن یا حتیٰ ایک گھنٹے کے لئے بھی ہو۔ یا آنحضرتؐ کی زیارت کی ہو، وہ بھی صحابی ہے!"

۲۔ بعض علماء نے صحابی کی تعریف کو محدود انداز میں پیش کیا ہے مثلاً "قاضی ابوبکر محمد ابن الطیب" لکھتے ہیں کہ "اگرچہ صحابی کا لغوی معنی عام ہے لیکن امت کے عرف عام میں اس اصطلاح کا اطلاق صرف ان افراد پر ہوتا ہے جو کافی عرصہ تک آنحضرتؐ کی صحبت میں رہے ہوں نہ ان لوگوں پر کہ جو صرف ایک گھنٹہ کی محفل میں بیٹھے ہوں یا آپؐ کے ساتھ چند قدم تک چلا ہو یا اس نے ایک آدھ حدیث آنحضرتؐ سے سن لی ہو"۔

۳۔ بعض علماء نے صحابی کی تعریف کا دائرہ اس سے بھی زیادہ تنگ کر دیا ہے جیسے "سعید بن المسیب" لکھتے ہیں کہ "پیغمبر کا صحابی وہ ہے جو کم از کم ایک یا دو سال آنحضرتؐ کے ساتھ رہا ہو اور ایک یا دو غزووں میں اس نے آنحضرتؐ کے ساتھ شرکت کی ہو" ( )

۱) تفسیر قرطبی جلد ۸، ص ۲۳۰۔

ان تعاریف اور دیگر تعریفوں میں کہ جنہیں طوالت کے خوف کی وجہ سے ذکر نہیں کیا جارہا ہے مشخص نہیں ہے کہ اس قداست کے دائرے میں آنے والے افراد کون سے ہیں۔ اکثر علماء نے اسی وسیع معنی کو اختیار کیا ہے۔ اگرچہ ہماری مدنظر ابحاث میں ان تعریفوں کے اختلاف سے زیادہ فرق نہیں پڑتا ہے۔ جیسا کہ عنقریب روشن ہو جائیگا کہ سیرت رسول کی خلاف ورزی کرنیوالے اکثر وہ افراد ہیں جو کافی عرصہ تک آپؐ کے ہمنشین رہے ہیں۔

۵: "عقیدہ تنزیہ کا اصلی سبب"

اس کے باوجود کہ اصحاب کی اس حد تک پاکیزگی کا عقیدہ رکھنا کہ جو بعض لحاظ سے عصمت کے مشابہ ہے نہ تو قرآن مجید میں اس کا حکم آیا ہے نہ احادیث میں بلکہ قرآن، سنت اور تاریخ سے اس کے برعکس مطلب ثابت ہے حتی کہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی میں اس قسم کا کوئی عقیدہ موجود نہیں تھا۔ تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ بعد والی صدیوں میں یہ مسئلہ کیوں اور کس دلیل کی بنا پر پیش کیا گیا ہے؟

ہمارے خیال کے مطابق اس عقیدہ کے انتخاب کی چند وجوہات تھیں

۱۔ اگر کمال حسن ظن سے کام لیا جائے تو ایک وجہ تو یہی ہے جسے سابقہ ابحاث میں ذکر کیا گیا ہے کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ اگر صحابہ کرام کا تقدس پامال ہو جائے تو انکے اور پیغمبرؐ کے درمیان حلقۂ اتصال ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ قرآن مجید اور پیغمبر اکرمؐ کی سنت انکے واسطے سے ہم تک پہنچی ہے۔

لیکن اس بات کا جواب بالکل واضح ہے کیونکہ کوئی بھی مسلمان معاذ اللہ تمام اصحاب کو فاسق اور کاذب نہیں کہتا ہے کیونکہ انکے درمیان ثقہ اور مورد اطمینان افراد کثرت کے ساتھ

تھے وہی با اعتماد افراد ہمارے اور پیغمبر اکرمؐ کے درمیان حلقۂ اتصال بن سکتے ہیں۔ جس طرح ہم شیعہ اہلبیت کے اصحاب کے بارے میں یہی نظریہ رکھتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بعد والی صدیوں میں بھی یہی مشکل موجود ہے کیونکہ آج ہم کئی واسطوں کے ذریعے اپنے آپ کو زمانہ پیغمبرؐ کے ساتھ متصل کرتے ہیں۔ لیکن کسی نے دعویٰ نہیں کیا کہ یہ تمام واسطے ثقہ اور صادق ہیں اور ہر صدی کے لوگ بڑے مقدس تھے اور اگر ایسا نہ ہو تو ہمارا دین متزلزل ہو جائیگا۔

بلکہ سب یہی کہتے ہیں کہ روایات کو ثقہ اور عادل افراد سے اخذ کرنا چاہیے۔

علم رجال کی کتب تحریر کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ثقہ کو غیر ثقہ سے ممتاز کیا جاسکے۔

تو اب کیا مشکل ہے کہ اصحاب کرام کے بارے میں بھی ہم وہی طریقہ عمل اختیار کریں جو ان سے بعد والوں کے بارے میں اختیار کرتے ہیں؟!

۲۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بعض صحابہ کے بارے میں "جرح" یعنی انکے نقائص بیان کرنے اور ان پر تنقید کرنے سے پیغمبر اسلامؐ کے مقام و منزلت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس لیے اصحاب پر تنقید جائز نہیں ہے۔

جو لوگ اس دلیل کا سہارا لیتے ہیں ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید نے پیغمبرؐ کے گرد جمع ہونے والے منافقین پر شدید ترین حملے نہیں کیے ہیں؟ کیا آنحضرتؐ کے خاص اور صادق اصحاب کے درمیان منافقین کی موجودگی کی وجہ سے آپؐ کی شان میں کمی واقع ہوئی ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے!

خلاصہ یہ کہ ہمیشہ اور ہر زمانے میں حتی تمام انبیاء کے زمانوں میں اچھے اور برے افراد

موجود تھے۔ اور جیاوء کے مقام و منزلت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

۳۔ اگر صحابہ کے اعمال پر جرح و تنقید کا سلسلہ شروع ہو جائے تو بعض خلفاء راشدین کی شخصیت پر حرف آتا ہے۔ اس لئے ان کے تقدس کی حفاظت کے لیے صحابہ پر قدامت کی تاکید کرنا چاہئے تاکہ کوئی شخص مثلاً حضرت عثمان کے ان کاموں پر اعتراض نہ کرے جو بیت المال کے بارے میں وہ اس کے علاوہ ان کے دور حکومت میں وقوع پذیر ہوئے اور یہ کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔

یہاں تک کہ اس قدامت کے قالب میں معاویہ اور ان کے اقدامات، جیسے کہ اس نے جانشین رسول حضرت علی علیہ السلام کی مخالفت کی اور ان کے ساتھ جنگیں کیں اور مسلمانوں کے قتل عام کا موجب بنا، کی توجیہ کی جا سکے، اور اس تصور کے ذریعے ایسے افراد کو تنقید سے بچایا جا سکے۔ بہتر اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قدامت والے مسئلہ کی بنیاد ابتدائی صدیوں کے سیاستدانوں نے رکھی۔ جیسے کہ انہوں نے کلمہ "اولی الامر" کی تفسیر "حاکم وقت" کی تاکہ بنو امیہ اور بنو عباس کے ظالم حکام کی اطاعت کو بھی ثابت کیا جا سکے جبکہ یہ حکام کا سیاسی پروگرام اور لائحہ عمل تھا۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ ان باتوں سے ان کا مقصد سب صحابہ کو بچانا نہ تھا بلکہ اپنے مورد نظر افراد کی حمایت مقصود تھی۔

۴۔ بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ صحابہ کے تقدس کا عقیدہ قرآن مجید اور سنت نبوی کے فرمان کے مطابق ہے کیونکہ قرآن مجید کی بعض آیات اور بعض احادیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

اگرچہ یہ بہترین توجیہ ہے لیکن جب ہم دلائل کی تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات اور روایات میں جس چیز کو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں موجود نہیں ہے۔ سب سے اہم آیت

جس کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے مندرجہ ذیل آیت ہے

"والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضي الله عنهم ورضوا عنه وأعد لهم جنات تجري تحتها الأنهار خالدين فيها أبدا ذلك الفوز العظيم" (۱)

مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے اور جنہوں نے نیکی کے ساتھ ان کی پیروی کی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں یہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

اہلسنت کے بہت سے مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں (بعض صحابہ اور پیغمبر اکرم سے حدیث) نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ "جميع أصحاب رسول الله في الجنة محسنهم ومسيئهم" اس حدیث میں مذکورہ بالا آیت سے استناد کیا گیا ہے۔ (۲)

دلچسپ یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت کہتی ہے کہ تابعین اس صورت میں اہل نجات ہیں جب نیکیوں میں صحابہ کی پیروی کریں (نہ برائیوں میں) اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ صحابہ کے لیے بہشت کی ضمانت دی گئی ہے۔ کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ گناہوں میں آزاد ہیں؟!

جو پیغمبر لوگوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے آیا ہے کیا ممکن ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو مستثنیٰ کر دے اور ان کے گناہوں سے چشم پوشی کرے۔ حالانکہ قرآن مجید ازواج رسول کے بارے میں فرماتا ہے کہ جو سب سے نزدیک صحابیہ تھیں، اگر تم نے گناہ کیا تو تمہاری سزا دو

(۱) سورہ توبہ آیت ۱۰۰
(۲) تفسیر کبیر فخر رازی و تفسیر [illegible]

برابر ہے۔(۱)

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اگر اس آیت میں کسی قسم کا ابہام بھی ہو تو اسے سورۂ فتح کی آیت نمبر ۲۹ رفع کر دیتی ہے کیونکہ یہ آیت پیغمبر اکرمؐ کے سچے اصحاب کی صفات بیان کر رہی ہے

"اشداء علی الکفار رحماء بینهم تراهم رکعا سجدا یبتغون فضلا من الله و رضوانا سیماهم فی وجوههم من اثر السجود"

یہ لوگ کفار کے مقابلے میں شدید اور درشت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں انہیں ہمیشہ رکوع و سجود کی حالت میں دیکھو گے اس حال میں کہ مسلسل فضل و رضائے خدا کو طلب کرتے ہیں۔ سجدہ کے آثار ان کے چہروں پر نمایاں ہیں"۔

جنہوں نے جمل و صفین جیسی جنگوں کی آگ بھڑکائی اور امام وقت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ہزاروں مسلمانوں کو قتل کرایا۔ کیا وہ ان صفات کے مصداق تھے کیا وہ آپس میں مہربان تھے؟ کیا ان کے عمل کی شدت کفار کے مقابلے میں تھی یا مسلمانوں کے مقابلے میں؟

اللہ تعالیٰ نے اسی آیت کے ذیل میں ایک جملہ ارشاد فرمایا ہے جو مقصود کو مزید روشن کرتا ہے

"وعد الله الذین آمنوا و عملوا الصالحات منهم مغفرة و اجرا عظیما"(۲)

اللہ تعالیٰ نے (ان اصحاب میں سے) جو ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دیے

۱) سورہ احزاب آیہ ۳۰
۲) سورہ فتح آیہ ۲۹

ان سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ دیا ہے۔

پس واضح ہو گیا کہ مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو با ایمان اور اعمال صالح انجام دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے جنگ جمل میں مسلمانوں کو قتل کیا اور اس جیسی جنگوں کو بھڑکایا اور حضرت عثمان کے دور میں بیت المال کو ہڑپ کیا وہ کیا اعمال صالح انجام دینے والے تھے؟

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولوالعزم پیغمبروں کا ایک ترک اولیٰ کی خاطر مواخذہ کیا ہے۔ حضرت آدمؑ کو ایک ترک اولیٰ کی خاطر بہشت سے نکال دیا۔ حضرت یونسؑ کو ایک ترک اولیٰ کی خاطر ایک عرصہ مچھلی کے پیٹ میں، تین اندھیروں میں بند رکھا۔ حضرت نوحؑ کو اپنے گناہگار بیٹے کی سفارش پر تنبیہ فرمائی۔ تو اب کیا یہ یقین کرنے کی بات ہے کہ اصحاب پیغمبرؐ اس قانون سے مستثنیٰ ہوں۔

۶۔ کیا تمام اصحاب بغیر استثناء کے عادل تھے؟:

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اکثر برادران اہلسنت اسی بات کے قائل ہیں کہ تمام صحابہ یعنی جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں تھے یا جنہوں نے آپؐ کے زمانے کو دیکھا اور کچھ عرصہ تک آپؐ کے ساتھ رہے ہیں بغیر کسی استثناء کے مقام عدالت پر فائز تھے اور قرآن مجید اسی بات کی گواہی دیتا ہے۔

مقام افسوس یہ ہے کہ ان بھائیوں نے قرآن کی کچھ ان آیات کو جو ان کے نفع میں تھیں قبول کر لیا ہے لیکن دوسری آیات سے انہوں نے چشم پوشی کی ہے ان آیات سے جن میں اس

بات سے استثناء موجود ہے (جیسا کہ واضح ہے کہ ہر عموم کے لئے عام طور پر استثناء موجود ہوتا ہے)۔

ہم عرض کریں گے:

کہ یہ کیسی عدالت ہے جس کے خلاف قرآن مجید نے بارہا گواہی دی ہے۔ منجملہ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۵ میں یوں بیان ہوا ہے۔

"ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان
انما استزلھم الشیطان ببعض ما کسبوا و لقد عفا
اللہ عنھم ان اللہ غفور حلیم"

اس آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو جنگ احد کے دن فرار کر گئے اور پیغمبر اکرمؐ کو دشمن کے مقابلہ میں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ آیت فرماتی ہے "جو لوگ دو لشکروں کے روبرو ہونے والے دن (یعنی جنگ احد میں) فرار کر گئے تھے۔ شیطان نے انہیں ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے بہکایا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا چونکہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بردبار ہے"۔

اس آیت سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس دن ایک گروہ فرار کر گیا تھا اور تاریخ میں اس گروہ کی تعداد بہت زیادہ ذکر کی گئی ہے اور دلچسپ یہ ہے کہ قرآن مجید کہتا ہے شیطان نے ان پر غلبہ کیا اور یہ غلبہ ان کے ان گناہوں کی وجہ سے تھا جس کے وہ پہلے مرتکب ہو چکے تھے۔ اس سے پتہ چلا کہ سابقہ گناہ ایک بڑے گناہ یعنی غزوہ سے فرار اور میدان اور دشمن سے پشت کر کے فرار کرنے کا موجب بنے۔ اگرچہ آیت کا ذیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بخش دیا۔

بخشش پروردگار پیغمبرؐ کی وجہ سے تھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عادل تھے اور انہوں نے گناہ نہیں کیا۔ بلکہ صراحت کے ساتھ قرآن مجید فرما رہا ہے کہ انہوں نے متعدد گناہ کیے۔

کیسی عدالت ہے کہ خداوند تعالیٰ قرآن مجید میں سورۃ حجرات کی آیت نمبر ۶ میں بعض کو فاسق کے عنوان سے یاد کر رہا ہے

"یا ایھا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا
ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم
نادمین"

اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ لاعلمی میں تم لوگ کسی کو نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر بعد میں اپنے کیے پر پشیمان ہو"

مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ یہ آیت "ولید بن عقبہ" کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسے ایک جماعت کے ساتھ "بنی المصطلق" قبیلہ کے پاس زکات کی جمع آوری کے لیے بھیجا۔ واپسی پر ولید نے کہا کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے اور اسلام کے خلاف انہوں نے قیام کر لیا ہے۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے ولید کی بات پر یقین کر لیا اور اس قبیلہ کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن سورۃ حجرات کی یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو خبردار کیا کہ "اگر ایک فاسق آدمی خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس جھوٹی خبر کی وجہ سے تم کسی قبیلہ کو نقصان پہنچاؤ اور پھر بعد میں اپنے کیے پر

پشیمان ہوں۔

اتفاقاً تحقیق کے بعد واضح ہوا کہ بنی المصطلق قبیلے کے لوگ مومن ہیں اور ولید کے استقبال کے لیے باہر آئے تھے نہ اسلام اور اس کے خلاف قیام کرنے کے لیے لیکن چونکہ ولید ان کے ساتھ سابقہ (قبل از اسلام) دشمنی رکھتا تھا اسی امر کا بہانہ بنا کر واپس چلا آیا اور غلط خبر پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں پیش کردی۔ ولید صحابی پیغمبر تھا۔ یعنی ان افراد میں سے تھا جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کو پایا اور آپؐ کی خدمت میں رہے۔ جبکہ قرآن مجید اس آیت میں اُسے فاسق بتا رہا ہے۔ کیا یہ آیت تمام اصحاب کی عدالت والے نظریہ کے ساتھ سازگار ہے؟

یہ کیسی عدالت ہے کہ بعض اصحاب زکاۃ کی تقسیم کے وقت پیغمبر اکرمؐ پر اعتراض کرتے ہیں۔ قرآن مجید ان کے اعتراض کو سورۂ توبہ آیہ ۵۸ میں نقل فرماتا ہے

"و منهم من يلمزك في الصدقات فان اعطوا منها رضوا و ان لم يعطوا منها اذا هم يسخطون"

"ان کے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو غنائم کی تقسیم میں آپؐ پر اعتراض کرتے ہیں اگر انہیں اس میں سے عطا کیا جائے تو راضی ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو غصے میں رہتے ہیں" کیا اس قسم کے افراد عادل ہیں؟

یہ کیسی عدالت ہے کہ قرآن مجید سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۱۲ اور ۱۳ میں جنگ احزاب کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ بعض منافقین اور بیمار دل لوگ جو پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں تھے اور انہوں نے جنگ میں شرکت کی لیکن پیغمبر اکرمؐ پر فریب کاری کی تہمت لگائی۔

"ما وعدنا الله و رسوله الا غرورا" خدا اور رسولؐ نے ہمیں صرف جھوٹے وعدے دیئے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ خیال رکھتے تھے کہ اس جنگ میں پیغمبر اکرمؐ کو شکست ہوگی اور تمام وہ قتل ہو جائیں گے اور اسلام کی بساط لپٹ جائے گی۔

یا ان روایات کے مطابق جنہیں شیعہ و سنی نے نقل کیا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خندق کھودنے کے دوران ایک پتھر ملا جسے آپؐ نے توڑا اور مسلمانوں کو شام، ایران اور یمن کی فتح کا وعدہ دیا تو ایک گروہ نے آنحضرتؐ کی اس بات کا مذاق اڑایا۔

کیا یہ اصحاب نہیں تھے؟ اور اس سے زیادہ عجیب بات تو بعد والی آیت بیان کر رہی ہے کہ "ان میں سے ایک گروہ نے (مدینہ کے بعض لوگوں کو کہ جو جنگ میں حاضر ہوئے تھے خطاب کرکے) کہا یہ تمہارے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ" "و اذ قالت طائفة منهم يا اهل يثرب لا مقام لكم فارجعوا"

اور پھر ایک گروہ آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور میدان جنگ سے فرار کرنے کے بہانے بنانے لگا۔ اسی آیت میں یوں ارشاد ہے "و يستاذن فريق منهم النبي يقولون ان بيوتنا عورة و ما هي بعورة ان يريدون الا فرارا" ان میں سے ایک گروہ پیغمبر اکرمؐ سے واپسی کی اجازت مانگتا تھا اور کہتا تھا کہ ہمارے گھر اکیلے ہیں لہٰذا ہمیں اجازت دیجئے تاکہ اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے واپس مدینہ چلے جائیں۔ یہ لوگ جھوٹ بول رہے تھے ان کے گھر اکیلے نہیں تھے۔ یہ صرف فرار کا بہانہ تلاش کر رہے تھے۔ آپ خود ہی فیصلہ کیجئے ہم کیسے ان تمام امور سے چشم پوشی کرلیں اور ان پر تنقید کو جائز نہ سمجھیں؟

ان سب سے بدتر بعض اصحاب کا پیغمبر اکرمؐ کی طرف خیانت کی نسبت دینا ہے اور قرآن مجید نے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۱ میں اسے منعکس کیا ہے" وما کان لنبی ان یغل و من یغلل یات بما غل یوم القیامة ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون"

"ممکن نہیں ہے کہ کوئی نبی خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا قیامت کے دن جس قسم کی خیانت کی ہوگی اسے اپنے ساتھ دیکھے گا، پھر ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائیگا۔ اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائیگا" یعنی گر پڑے گی تو انکے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگی۔

"اس آیت کی دو شان نزول بیان کی گئی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت "عبداللہ بن جبیر" کے دوستوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ جنگ احد میں "عینین" نامی مورچہ میں تھے۔ اور جب جنگ کی ابتداء میں اسلام کا لشکر دشمن پر فتح پا گیا تو عبداللہ کے ہمراہ تیر انداز تھے حالانکہ رسول خداؐ نے فرمایا تھا کہ تمہیں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرنی چاہئے اس گروہ نے اپنا مورچہ چھوڑ دیا اور غنائم لوٹنے کے پیچھے دوڑ پڑے۔ ان سے بھی زیادہ عمل ان کی باتیں تھیں کہ کہتے تھے کہ ہمیں خطرہ ہے کہیں رسول خداؐ ہمارا حق ہمیں نہ دیں (اور اس قسم کے جملے کہ جنہیں لکھنے سے قلم شرم محسوس کرتی ہے)۔

"ابن کثیر" اور "طبری" نے اسی آیت کے ذیل میں اپنی تفسیر میں ایک اور شان نزول کو ذکر کیا ہے۔ وہ یہ کہ جنگ بدر میں کامیابی کے بعد ایک سرخ رنگ کا قیمتی کپڑا گم ہوگیا۔ بعض کم عقل لوگوں نے رسول خداؐ کو خیانت سے متہم کیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کپڑا مل گیا اور معلوم ہوا کہ لشکر میں موجود فلاں شخص نے اٹھایا تھا۔

پیغمبر اکرمؐ کی طرف اس قسم کی ناروا نسبتیں دینے کے باوجود کیا عدالت باقی رہتی ہے؟ اگر ہم اپنے وجدان کے ساتھ قضاوت کریں تو کیا قبول کریں گے کہ اس قسم کے افراد عادل اور پاک و پاکیزہ تھے اور کسی کو انکے ایسے کاموں پر تنقید کرنے کا حق نہیں ہے؟

ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے اکثر اصحاب و یاران با تقوی اور پاکیزہ انسان تھے۔ لیکن سب کے لیے ایک ہی حکم لگا دینا اور سب پر تقوی اور عدالت کی قلعی چڑھا دینا اور ان پر کسی قسم کی تنقید کرنے کا حق سلب کر دینا ایک انتہائی عجیب بات ہے۔

یہ کیسی عدالت ہے کہ ایک انسان جو خود ہمارا پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب میں سے ہے (ہمارا مقصود معاویہ ہے) نبی اکرمؐ کے با عظمت صحابی حضرت علیؑ پر سالہا سال سب و لعن کرتا ہے اور تمام شہروں میں سب کو اس کام کا حکم دیتا ہے۔

ان دو حدیثوں کی طرف توجہ فرمائیے

ا۔ صحیح مسلم میں کہ جو اہلسنت کی معتبر ترین کتاب ہے یوں بیان ہوا ہے۔

کہ "معاویہ" نے "سعد بن ابی وقاص" سے کہا کہ کیوں ابو تراب (علی ابن ابی طالب) پر سب و لعن سے پرہیز کرتے ہو؟ اس نے کہا میں نے پیغمبر اکرمؐ سے ان کے بارے میں تین فضائل ایسے سنے ہیں کہ اگر وہ میرے بارے میں ہوتے تو میرے لیے دنیا کی عظیم دولت سے زیادہ اہمیت رکھتے۔ اس لیے میں ان پر سب و شتم نہیں کرتا ہوں۔ (۱)

۱) صحیح مسلم جلد ۴ ص ۱۸۷۱ کتاب فضائل الصحابہ اور اسی طرح کتاب فتح الباری فی شرح صحیح البخاری جلد ۷ ص ۶۰ پر بھی یہ حدیث بیان ہوئی ہے (وہ تین فضیلتیں یہ ہیں: ۱۔ حدیث منزلت ۲۔ حدیث لاعطین الرایة غدا ۳۔ آیت مباہلہ)۔

۲۔ کتاب "العقد الفرید" میں کہ جسے اہلسنت کے بزرگ عالم دین (ابن عبد ربہ اندلسی) نے تالیف کیا ہے یوں بیان ہوا ہے کہ جب امام حسن ابن علی علیہم السلام کی شہادت ہوئی اس کے بعد معاویہ حج کے بعد مدینہ آیا، اس کا ارادہ تھا کہ مدینہ میں مسجد رسولؐ سے حضرت علی علیہ السلام پر سب و لعن کرے۔ لوگوں نے کہا کہ "سعد بن ابی وقاص" بھی مسجد میں ہے اور ہمارے خیال کے مطابق وہ تیری اس بات کو تحمل نہیں کریگا اور شدید ردّ عمل کا اظہار کرے گا لہذا کسی کو اس کے پاس بھیج کر اس کی نظر معلوم کرو۔

معاویہ نے ایک آدمی کو سعد کے پاس بھیجا اور اس مطلب کے بارے میں استفسار کیا سعد نے جواب میں کہا کہ اگر معاویہ نے یہ کام کیا تو میں رسولخداؐ کی مسجد سے باہر چلا جاؤں گا اور پھر کبھی بھی مسجد نبوی میں داخل نہیں ہوں گا۔

معاویہ نے یہ پیغام اور ردّ عمل سننے کے بعد سب و شتم سے پرہیز کیا۔ یہاں تک کہ سعد فوت ہو گئے۔ سعد کی وفات کے بعد معاویہ نے منبر سے حضرت علیؑ پر لعنت کی اور اپنے تمام اہلکاروں کو حکم دیا کہ منبروں سے حضرت پر لعن و سب کریں۔ اُن سب نے بھی یہی کام کیا۔ اس بات کا جب جناب ام سلمہ زوجہ پیغمبرؐ کو پتہ چلا تو انہوں نے معاویہ کے نام ایک خط میں یوں لکھا کہ "تم کیوں منبروں سے خدا اور رسولؐ پر سب و لعن کرتے ہو؟ کیا تم یوں نہیں کہتے ہو کہ علیؑ اور اسکے چاہنے والوں اور محبت کرنیوالوں پر لعنت، میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالی حضرت علیؑ سے محبت کرتا ہے اور رسولخداؐ بھی حضرت علیؑ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ پس حقیقت میں تم خدا اور رسولخداؐ پر سب و لعن کرتے ہو" معاویہ نے جناب ام سلمہ کا خط پڑھا لیکن اس کی کوئی پرواہ نہ کی (۱)

۱) العقد الفرید، جلد ۳ ص ۳۶۶ وجواہر المطالب فی مناقب الامام علی بن ابی طالب، جلد ۲ ص ۲۲۸ تالیف ابو البرکات الدمشقی الشافعی متوفی ۹ ویں قرن ہجری قمری۔

کیا اس قسم کے برے کام عدالت کے ساتھ سازگار ہیں؟ کیا کوئی عاقل یا عادل انسان یہ جرأت کر سکتا ہے کہ حضرت علیؑ جیسی باعظمت شخصیت کو اس شرمناک انداز اور بے تحاشا وسیع پیمانے پر گالیاں دے۔

ایک عرب شاعر یوں کہتا ہے

اعلی المنابر تعلنون بسبہ و بسیفہ نصبت لکم اعوادھا؟!

کیا منبر سے اس شخصیت پر لعن کرتے ہو جس کی تلوار کی برکت سے یہ منبر قائم ہوئے ہیں۔

۷۔ اصحاب پیغمبرؐ کی اقسام:

رسولخداؐ کے اصحاب کو، قرآن مجید کی گواہی کے مطابق، پانچ اصلی گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پاک و صالح یہ فرد مؤمن اور با اخلاص تھے۔ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نفوذ کر چکا تھا۔ یہ لوگ راہ خدا میں اور کلمۂ اسلام کی بلندی کے لیے کسی قسم کے ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ یہ وہی گروہ ہے جس کی طرف سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۰ میں اشارہ ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی تھا اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کے الطاف پر راضی تھے۔" رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ"

۲۔ مؤمن خطاکار یہ وہ گروہ ہے جو ایمان اور عمل صالح رکھنے کے باوجود بھی کبھی کبھار لغزش کا شکار ہو جاتے تھے اور اعمال صالح اور غیر صالح کو آپس میں مخلوط کر دیتے تھے۔ اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے تھے۔ ان کے عفو و بخشش کی امید ہے جیسے کہ سورۂ توبہ

کی آیہ ۱۰۲ میں پہلے گروہ کو بیان کرنے کے بعد خدا تعالیٰ نے اس گروہ کا تذکرہ کیا ہے۔

"و آخرون اعترفوا بذنوبهم خلطوا عملاً صالحاً و آخر سيئاً عسى الله ان يتوب عليهم"

۳۔ **گناہگار افراد۔** یہ وہ گروہ ہے جس کے لیے قرآن مجید نے فاسق کا نام انتخاب کیا ہے۔ کہ اگر فاسق تمہارے لئے خبر دے تو بغیر تحقیق کے قبول نہ کرنا۔ سورہ حجرات کی آیہ نمبر ۶ میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے "یا ایها الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا" اس آیت کا مصداق شیعہ و سنی تفاسیر میں ذکر کیا گیا ہے۔

۴۔ **ظاہری مسلمان:** یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کا دعویٰ کرتے تھے لیکن ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا تھا۔ سورہ حجرات کی چودھویں آیت میں اس گروہ کی طرف اشارہ ہوا ہے "قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا ولما يدخل الايمان في قلوبكم"

۵۔ **منافقین:** یہ وہ گروہ ہے جو روح نفاق کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان چھپے ہوئے تھے کبھی ان کی شناخت ہو جاتی اور کبھی نہ ہوتی تھی۔ یہ لوگ اسلام اور مسلمین کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانے سے باز نہیں رہتے تھے۔ سورہ توبہ میں ہی مومن و صالح گروہ کی طرف اشارہ کے بعد آیت ۰ میں ان منافقین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

"و ممن حولكم من الاعراب منافقون و من اهل المدينة مردوا على النفاق" بے شک ان تمام گروہوں نے پیغمبر اکرم کا دیدار کیا تھا اور آنحضرتؐ کے ساتھ مصاحبت اور معاشرت رکھتے تھے۔ اور ان میں سے بہت ساروں نے غزووں میں شرکت کی

تھی۔ اور ہم صحابہ کی جو تعریف بھی کریں ان پانچوں گروہوں پر صادق آتی ہے کیا سب کو اہل بہشت اور پاکیزہ شمار کیا جا سکتا ہے؟ کیا قرآن مجید کی صراحت کے بعد یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم راہ اعتدال کو اپنائیں اور اصحاب کو قرآن مجید میں بیان شدہ پانچ گروہوں میں تقسیم کریں اور ان میں سے نیک، باتقویٰ اصحاب کے بے انتہائی احترام کے قائل ہوں اور دیگر گروہوں میں سے ہر ایک کو ان کے مقام پر رکھیں۔ اور غلو، افراط اور تعصب سے پرہیز کریں۔ (اور انصاف کے ساتھ قضاوت کریں)

۸۔ **تاریخی گواہی** تمام اصحاب کی قداست کے عقیدے نے اس کے طرفداروں کے لیے بہت سی مشکلات ایجاد کی ہیں۔ ان عظیم مشکلات میں سے ایک تاریخی حقائق ہیں۔ کیونکہ اکثر معروف اور مورد اعتماد تاریخی کتب میں حتی صحاح ستہ کی احادیث میں بعض صحابہ کی شدید لڑائی اور جنگ کے تذکرے ہیں ایسی صورتحال میں ہم فریقین کو عادل، صالح اور مقدس شمار نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ یہ کام ضدین کے درمیان جمع کرنا ہے اور ضدین کے درمیان جمع نہ ہو سکنا ایک واضح عقلی فیصلہ ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔

جنگ جمل اور صفین کے علاوہ کہ جو طلحہ، زبیر اور معاویہ نے امام المسلمین حضرت علی علیہ السلام کے مقابلہ میں لڑیں اگر ہم حقائق سے چشم پوشی نہ کریں تو حتماً جنگ بھڑکانے والوں کی غلطیوں اور جنایتوں کا اعتراف کریں گے۔ اور اس سلسلہ میں بہت سے تاریخی شواہد موجود ہیں۔ اس مختصر کتاب میں ہم صرف تین نمونوں پر اکتفا کریں گے۔

۱۔ امام بخاری اپنی کتاب صحیح میں کتاب التفسیر میں مسئلہ افک کے بارے میں (زوجہ پیغمبرؐ کے بارے میں جو تہمت لگائی گئی تھی) لکھتے ہیں کہ ایک دن پیغمبر اکرمؐ منبر پر تشریف

ے گئے اور فرمایا اے مسلمانوں! کون اس شخص کو سزا دے گا (مقصود عبداللہ بن سلول تھا جو منافقین کا ایک سرغنہ تھا) مجھے بتایا گیا ہے کہ اس نے میری بیوی پر تہمت لگائی ہے حالانکہ میں نے اپنی بیوی میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی سعد بن معاذ انصاری (مشہور صحابی) اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کی، میں اس کو سزا دوں گا اگر یہ "اوس" قبیلے سے ہوا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اور اگر یہ خزرج قبیلے سے ہوا تو جو حکم آپ صادر فرمائیں گے ہم انجام دیں گے۔ سعد بن عبادہ خزرج قبیلے کا سردار کہ جو اس سے پہلے صالح آدمی تھا قبائلی تعصب کی وجہ سے سعد بن معاذ کو کہنے لگا خدا کی قسم تو جھوٹ بول رہا ہے تیری اتنی جرأت نہیں ہے کہ تو یہ کام کر سکے اسید بن حضیر (سعد بن معاذ کا چچا زاد) کہنے لگا کہ خدا کی قسم تو جھوٹا ہے یہ شخص منافقین میں سے ہے ہم اسے ضرور قتل کریں گے۔ نزدیک تھا کہ قبیلہ اوس و خزرج کی آپس میں جنگ چھڑ جائے۔ رسول خداؐ نے انہیں خاموش کرایا(۱) کیا یہ سب افراد صالح صحابی تھے؟

۲ معروف دانشمند "بلاذری" اپنی کتاب "الانساب" میں لکھتے ہیں کہ "سعد بن ابی وقاص" کوفہ کے والی تھے، حضرت عثمان نے انہیں معزول کر دیا اور "ولید بن عقبہ" کو ان کی جگہ گورنر بنا دیا۔ عبداللہ بن مسعود اس دوران بیت المال کے خزانہ دار تھے جب ولید کوفہ میں داخل ہوا تو اس نے عبداللہ ابن مسعود سے بیت المال کی چابیاں طلب کیں۔ عبداللہ نے چابیاں ولید کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا کہ خلیفہ نے سنت (رسولؐ) کو تبدیل کر دیا ہے۔ سعد بن ابی وقاص جیسے آدمی کو معزول کر کے ولید جیسے آدمی کو اپنا جانشین منتخب کر لیا ہے؟ ولید نے حضرت عثمان کو خط میں لکھا کہ عبداللہ بن مسعود آپ پر تنقید کرتا ہے خلیفہ نے جواب لکھا

۱) صحیح بخاری جلد ۵ص ۱۱۸۔

کہ اسے حکومت کی نگرانی میں میرے پاس بھیج دیا جائے۔ جب عبداللہ بن مسعود مدینہ میں وارد ہوا تو خلیفہ منبر پر تھے جیسے ہی انکی نظر عبداللہ بن مسعود پر پڑی تو کہنے لگے ذرا جانور داخل ہوگیا ہے! (اور بہت سی گالیاں دیں قلم جنہیں لکھنے سے شرم محسوس کرتا ہے) عبداللہ بن مسعود کہنے لگے میں ایسا نہیں ہوں، میں رسول خداؐ کا صحابی ہوں۔ جنگ بدر اور بیعت رضوان میں شریک تھا۔

حضرت عائشہ عبداللہ کی حمایت کے لیے اٹھیں لیکن حضرت عثمان کا غلام عبداللہ کو مسجد سے باہر لے گیا اور انہیں زمین پر پٹخا اور ان کی پسلیاں توڑ دیں(۱)

۳ بلاذری اپنی کتاب انساب الاشراف میں نقل کرتے ہیں کہ مدینہ کے بیت المال میں بعض جواہرات اور زیورات تھے حضرت عثمان نے ان میں سے کچھ زیورات اپنے گھر والوں کو بخش دیئے۔ جب لوگوں نے دیکھا تو کھلے عام اعتراض شروع کر دیا اور ان کے بارے میں سخت باتیں کہیں حضرت عثمان کو غصہ آگیا اور وہ منبر پر گئے اور خطبہ کے دوران کہا ہم غنائم میں سے اپنی ضرورت کے مطابق اٹھائیں گے!! اگرچہ لوگوں کی ناک زمین پر رگڑی جائے!!

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے کہا کہ "مسلمان خود تمہارا راستہ روک لیں گے"!
جناب عمار یاسر نے کہا سب سے پہلے میری ناک زمین پر رگڑی جائے گی!
(اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میں تنقید سے باز نہیں آؤں گا)
حضرت عثمان کو غصہ آگیا اور کہنے لگے تو نے میری شان میں گستاخی کی ہے۔ اس کو گرفتار

۱) انساب الاشراف جلد ۵ ص ۳۶، تاریخ ابن کثیر جلد ۷ ص ۱۶۳، ۱۸۳، حوادث سال ۳۲ (خلاصہ)۔

کرلو۔ لوگوں نے جناب عمار کو پکڑ لیا اور عثمان کے گھر لے گئے وہاں انہیں اس قدر مارا گیا کہ وہ بے ہوش ہوگئے۔ اس کے بعد انہیں جناب ام سلمہ (زوجہ پیغمبرؐ) کے گھر لایا گیا وہ پورا وقت بے ہوشی کے عالم میں تھے یہاں تک کہ انکی ظہر، عصر اور مغرب کی نماز قضا ہوگئی جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے وضو کر کے نماز ادا کی اور کہنے لگے یہ پہلی بار نہیں ہے کہ ہمیں خدا کی خاطر اذیت و آزار پہنچائی جا رہی ہے۔(۱) (ان واقعات کی طرف اشارہ تھا جنکا انہیں جاہلیت میں کفار کیطرف سے انہیں سامنا کرنا پڑا تھا)۔

ہم ہرگز مائل نہیں ہیں کہ تاریخ اسلام کے اس قسم کے ناگوار حوادث کو نقل کریں (دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است!) مگر ہمارے بھائی تمام صحابہ اور انکے تمام کاموں کے تقدس پر اصرار نہ کرتے تو شاید انکے متعدد ... کے نقل کرنے میں بھی مصلحت نہیں تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ صحابہ رسولؐ میں سے تین پاکیزہ ترین افراد (سعد بن معاذ، عبداللہ ابن مسعود، عمار یاسر) کو گالیاں دینے اور مارنے پیٹنے کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے؟ ایک بااعظمت صحابی کو اتنا مارا جائے کہ انکی پسلیاں ٹوٹ جائیں اور دوسرے کو اتنا مارا جائے کہ بے ہوش ہو جائے اور اس کی نمازیں قضا ہو جائیں۔

کیا یہ تاریخی شواہد کہ جنکے نمونے بہت زیادہ ہیں ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم حقائق سے چشم پوشی کریں اور کہیں کہ تمام اصحاب اچھے اور انکے تمام کام صحیح تھے۔ اور ایک جملہ "صحابہ" کے نام سے بنا دیں اور انکے تمام کاموں کا بلاشرط دفاع کریں۔

کیا کوئی بھی عقلمند اس قسم کے افکار کو پسند کرتا ہے؟

۱) انساب الاشراف جلد ۶ ص ۱۶۱۔

اس مقام پر پھر تکرار کرتے ہیں کہ رسولخداؐ کے اصحاب میں مومن، صالح اور پارسا افراد بہت سے تھے لیکن کچھ ایسے افراد بھی تھے جنکے کاموں پر تنقید کرنا چاہیے اور انکی تحلیل کرتے ہوئے انہیں عقل کے ترازو پر تولنا چاہیے اور اس کے بعد انکے بارے میں حکم لگانا چاہیے۔

۱۔ پیغمبرؐ کے زمانے میں یا اس کے بعد بعض صحابہ پر حدّ کا جاری ہونا!

صحاح ستہ یا برادران اہلسنت کی دیگر معروف کتابوں میں کچھ موارد ایسے دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں بعض اصحاب، رسولخداؐ کے زمانے میں یا اس کے بعد ایسے گناہوں کے مرتکب ہوئے جن کی حد سزا تھی۔ لہٰذا ان پر حد جاری کی گئی۔

کیا اس کے باوجود آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب عادل تھے؟ اور ان سے کوئی غلطی نہیں ہوئی؟ یہ کیسی عدالت ہے کہ یہ تصور کیا جائے جس پر حد جاری ہوتی ہو اور ان پر حد جاری ہونے کے بعد بھی عدالت اپنی جگہ محکم باقی رہتی ہے؟

ہم ذیل میں نمونے کے طور پر چند موارد کی طرف اشارہ کرتے ہیں

الف) "نعیمان" صحابی نے شراب پی، پیغمبر کرمؐ نے حکم صادر فرمایا اور اسے تازیانے مارے گئے(۱)

ب) "بنی اسلم" قبیلے کے ایک مرد نے زنائے محصن کیا تھا۔ پیغمبر کرمؐ کے حکم پر اسے سنگسار کر دیا گیا(۲)

۱) صحیح بخاری جلد ۸ ص ۱۳ حدیث نمبر ۶ کتاب الحدود۔
۲) صحیح مسلم جلد ۳ ص ۱۳۲۰ حدیث ۱۶۹۲۔

ج) واقعۂ افک میں پیغمبر اکرمؐ کے حکم پر چند افراد پر حدِ قذف جاری کی گئی تھی (۱)

د) پیغمبر اکرمؐ کے بعد عبد الرحمٰن بن عمر اور عقبہ بن حارث بدری نے شراب پی اور مصر کے امیر عمرو ابن عاص نے ان پر حدِ شرعی جاری کی۔ اس کے بعد عمر نے دوبارہ اپنے بیٹے کو بلوا کر دوبارہ اس پر حد جاری کی (۲)

ہ) ولید بن عقبہ کا واقعہ مشہور ہے کہ اس نے شراب پی اور مستی کے عالم میں صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی۔ اسے مدینہ حاضر کر کے شراب کی حد اس پر جاری کی گئی۔ (۳)

ان کے علاوہ اور بہت سے موارد ہیں، مصلحت کی خاطر جن کے ذکر سے اجتناب کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود کیا اب بھی ہم حقائق کے سامنے آنکھیں اور کان بند کر لیں اور کہہ دیں کہ سب اصحاب عادل تھے؟!

۱۰۔ نادرست توجیہات

۱۔ تنزیہ اور ہر لحاظ سے تقدس کے نظریہ کے طرفدار جب متضاد حالات کے انبوہ سے روبرو ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو اس توجیہ کے ساتھ قانع کرتے ہیں کہ سب صحابہ "مجتہد" تھے اور ہر ایک نے اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کیا۔ یقیناً یہ تو ضمیر اور وجدان کو فریب دینا ہے کہ ہر دوران اس قسم کے آشکار اختلافات میں اس بوگس توجیہ کا سہارا لیں۔

۱) المعجم الکبیر جلد ۲۳ ص ۱۲۸ و کتب دیگر۔
۲) السنن الکبریٰ بیہقی جلد ۸ ص ۳۱۲ اور بہت سی کتب۔
۳) صحیح مسلم جلد ۵ ص ۱۲۶ حدیث نمبر ۱۷۰۷۔

کیا بیت المال کو ہڑپ کرنے کے بارے میں ایک معمولی سی تنقید اور سادہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مقابلے میں ایک مؤمن صحابی کو اتنا مارنا کہ وہ بے ہوش ہو اور اس کی نمازیں قضا ہو جائیں، اجتہاد ہے؟ کیا ایک اور مشہور صحابی کی پسلیاں توڑ دینا صرف اس اعتراض کی خاطر جو اس نے کیا کہ کیوں ایک شرابی (ولید) کو کوفہ کا حاکم تعیین کیا گیا ہے، اجتہاد شمار ہوتا ہے؟

اس سے بڑھ کر امام المسلمین کے مقابلے میں کہ جو مقامات الٰہی کے ساتھ ساتھ تمام مسلمانوں کے منتخب کردہ اتفاقی خلیفہ تھے، صرف جاہ طلبی اور حکومت حاصل کرنے کی خاطر جنگ کی آگ بھڑکانا جس میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہہ جائے، اجتہاد شمار ہوتا ہے؟

اگر یہ موارد اور اس کی مثل، اجتہاد کی شاخیں شمار ہوتی ہیں تو پھر طول تاریخ میں ہونے والی تمام جنایات کی بھی توجیہ کی جا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ کیا اجتہاد صرف اصحاب میں منحصر تھا یا کم از کم چند صدیوں بعد بھی امت اسلامی میں کثرت کے ساتھ مجتہد موجود تھے بلکہ بعض علمائے اہلسنت کے اعتراف اور تمام علمائے شیعہ کے مطابق آج بھی تمام علماء کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے؟

جو افراد اس قسم کے بھیانک افعال انجام دیں کیا آپ انکے افعال کی توجیہ کرنے کو حاضر ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔

۲۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں سکوت اختیار کریں۔

"تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ" (۱)

۱) سورۂ بقرہ آیت ۱۳۴۔

وہ ایک امت ہیں جو گزر چکے انکے اعمال انکے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ اور آپ سے انکے اعمال کے بارے میں نہیں پوچھا جائیگا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ ہماری سرنوشت میں مؤثر نہ ہوتے تو پھر یہ بات اچھی تھی۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کی روایت کو انکے توسط سے دریافت کریں اور انہیں اپنے لیے نمونہ عمل قرار دیں۔ تو کیا اس وقت یہ ہمارا حق نہیں ہے کہ ثقہ اور غیر ثقہ اسی طرح عادل اور فاسق کی شناخت کریں تا کہ اس آیت "إن جاءكم فاسق بنبأ فتبينوا" اگر فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تحقیق کیجیے" (۱) پر عمل کر سکیں۔

۱۱۔ مظلومیت علیؑ

جو بھی تاریخ اسلام کا مطالعہ کرے اس نکتہ کو با آسانی درک کر سکتا ہے کہ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ حضرت علی علیہ السلام جو علم و تقوی کا پہاڑ، پیغمبر اکرمؐ کے نزدیک ترین ساتھی اور اسلام کے سب سے بڑے مدافع تھے، انہیں اسطرح ہتک حرمت، توہین اور سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا۔

انکے دوستوں کو اسطرح دردناک اذیتوں اور مظالم سے دوچار کیا گیا کہ تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ وہ بھی ان افراد کیطرف سے جو اپنے آپ کو پیغمبر اکرمؐ کا صحابی شمار کرتے ہیں۔

چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

الف) لوگوں نے علی ابن جہم خراسانی کو دیکھا کہ اپنے باپ پر لعنت کر رہا ہے جب وجہ

۱) سورۂ حجرات آیہ ۶۔

پوچھی گئی تو کہنے لگا: اس لئے لعنت کر رہا ہوں کیونکہ اس نے میرا نام علی رکھا ہے۔ (۱)

ب) معاویہ نے اپنے تمام کارندوں کو آئین نامہ میں لکھا جس نے بھی ابوتراب (علی علیہ السلام) اور انکے خاندان کی کوئی فضیلت نقل کی وہ ہماری امان سے خارج ہے (اس کی جان و مال مباح ہے) اس آئین نامہ کے بعد سب خطباء پوری مملکت میں منبر سے علی الاعلان حضرت علی پر سب و شتم کرتے اور ان سے اظہار بیزاری کرتے تھے۔ اس طرح ناروا نسبتیں انکی اور انکے خاندان کی طرف دیتے تھے۔ (۲)

ج) بنو امیہ جب بھی سنتے کہ کسی نومولود کا نام علی رکھا گیا ہے اسے فوراً قتل کر دیتے۔ یہ بات سلمۃ بن شبیب نے ابو عبد الرحمن مقری سے نقل کی ہے۔ (۳)

د) زمخشری اور سیوطی نقل کرتے ہیں کہ بنو امیہ کے دور حکومت میں ستر ہزار سے زیادہ منبروں سے سب علی کیا جاتا تھا اور یہ بدعت معاویہ نے ایجاد کی تھی۔ (۴)

ہ) جس وقت عمر بن عبد العزیز نے حکم دیا کہ اس بری بدعت کو ختم کیا جائے اور نماز جمعہ کے خطبوں میں امیر المومنین علی علیہ السلام کو برا بھلا نہ کہا جائے تو مسجد سے نالہ و فریاد بلند ہوگئی اور سب عمر بن عبد العزیز کو کہنے لگے "ترکت السنة ترکت السنة" تو نے سنت کو ترک کر دیا ہے۔ تو نے سنت کو ترک کر دیا ہے۔ (۵)

۱) لسان المیزان جلد ۴ ص ۲۱۰۔
۲) النصائح الکافیہ ص ۷۲۔
۳) تہذیب الکمال جلد ۲۰ ص ۴۳۰، سیر اعلام النبلاء جلد ۵ ص ۱۰۲۔
۴) ربیع الابرار جلد ۲ ص ۱۸۶ اور النصائح الکافیہ ص ۷۹ از سیوطی۔
۵) النصائح الکافیہ ص ۱۱۶ [illegible] ص ۵۹۔

یہ سب اس صورت میں ہے کہ برادران اہلسنت کی معتبر اور صحیح کتب کی روایت کے مطابق پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ "من سبّ علیاً فقد سبّنی و من سبّنی فقد سبّ اللہ" جس نے علی کو گالی دی اس نے مجھے گالی دی اور جس نے مجھے گالی دی اس نے خدا کو گالی دی!!"(۱)

۱۲: ایک دلچسپ داستان

حسن اختتام کے طور پر شاید اس واقعہ کو نقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہ ہو کہ جو خود ہمارے ساتھ مسجد حرام میں پیش آیا ہے۔

ایک دفعہ جب عمرہ پر جانے کا اتفاق ہوا تو ایک رات ہم مغرب وعشاء کی نماز کے درمیان مسجد الحرام میں بیٹھے تھے کہ کچھ علماء حجاز کے ساتھ تمام اصحاب کے تقدس کے بارے میں ہماری بحث شروع ہوگئی، وہ معمول کے مطابق اعتقاد رکھتے تھے کہ اصحاب پر معمولی سی بھی تنقید نہیں کرنا چاہیے۔ یا یوں کہہ دیجیے کہ پھول سے زیادہ نازک اعتراض بھی ان پر نہیں کرنا چاہیے۔ ہم نے ان کے ایک عالم کو مخاطب کر کے کہا: آپ فرض کیجیے کہ اس وقت "جنگ صفین" کا میدان گرم ہے۔ آپ دو صفوں میں سے کس کا انتخاب کریں گے؟ صف علی کا یا صف معاویہ کا؟

کہنے لگے: یقیناً صف علی کا انتخاب کروں گا۔

میں نے کہا: اگر حضرت علی آپ کو حکم دیں کہ یہ تلوار لے کر معاویہ کو قتل کر دیں تو آپ کیا کریں گے؟

(۱) اخرجہ الحاکم و صححہ و اقرّہ الذھبی (مستدرک الصحیحین، جلد ۳، ص ۱۲۱)۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے کہ معاویہ کو قتل کردوں گا لیکن اس پر بھی تنقید نہیں کروں گا!!

ہاں یہ ہے غیر منطقی عقائد پر اصرار کرنے کا نتیجہ کہ اس وقت دفاع بھی غیر منطقی ہوتا ہے اور انسان سنگلاخ میں پھنس جاتا ہے۔

حق یہ ہے کہ یوں کہیں قرآن مجید اور تاریخ اسلام کی شہادت کے مطابق، صحابہ پیغمبر اکرمؐ ایک تقسیم کے مطابق چند گروہوں پر مشتمل تھے۔ اصحاب کا ایک گروہ ایسا تھا جو شروع میں پاک، صادق اور صالح تھا اور آخر تک وہ اپنے تقویٰ پر ثابت قدم رہے۔ "عاشوا سعداء و ماتوا السعداء" انہوں نے سعادت کی زندگی گزاری اور سعادت کی موت پائی۔

ایک گروہ ایسا تھا جو آنحضرت کی زندگی میں تو صالح اور پاک افراد کی صف میں تھے لیکن بعد میں انہوں نے جاہ طلبی اور حب دنیا کی خاطر اپنا راستہ تبدیل کر لیا تھا۔ اور ان کا خاتمہ خیر و سعادت پر نہیں ہوا (جیسے جمل وصفین کی آگ بھڑکانے والے)

اور تیسرا گروہ شروع سے ہی منافقوں اور دنیا پرستوں کی صف میں تھا۔ اپنے خاص مقاصد کی خاطر وہ مسلمانوں کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے جیسے ابوسفیان وغیرہ یہاں پر پہلے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم یوں کہیں گے۔

"ربنا اغفر لنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان و لا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا ربنا انک رءوف رحیم" (۱)

(۱) سورۂ حشر آیت ۱۰۔

٤

بزرگوں کی قبروں کا احترام

سعالی خاکہ

اس مسئلہ میں ہمارے مخاطب صرف شدت پسند وہابی ہیں۔ کیونکہ اسلام کے بزرگوں کی قبور کی زیارت کو مسلمانوں کے تمام فرقے (سوائے اس چھوٹے سے گروہ کے) جائز سمجھتے ہیں۔ بہرحال بعض وہابی ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ تم کیوں مذہبی رہنماؤں کی زیارت کے لیے جاتے ہو؟

اور ہمیں "قبور پرست" کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ پوری دنیا میں لوگ اپنے گذشتہ بزرگوں کی آرام گاہوں کی اہمیت کے قائل ہیں اور انکی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔

مسلمان بھی ہمیشہ اپنے بزرگوں کے مزاروں کی اہمیت کے قائل تھے اور ہیں اور انکی زیارت کے لیے جاتے تھے اور جاتے ہیں۔ صرف ایک چھوٹا سا شدت پسند وہابی ٹولہ انکی مخالفت کرتا ہے اور اپنے آپ کو پوری دنیا کے مسلمان ہونے کا دعویدار اور ٹھیکیدار سمجھتا ہے۔

البتہ بعض مشہور وہابی علماء نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ پیغمبر اکرم کی قبر مبارک کی زیارت کرنا مستحب ہے لیکن زیارت کی نیت سے رخت سفر نہیں باندھنا چاہیے۔ یعنی مسجد النبی کی زیارت کے قصد یا اس میں عبادت کی نیت سے یا عمرہ کی نیت سے مدینہ آئیں اور ضمناً پیغمبر اکرم کی قبر کی زیارت بھی کرلیں۔ لیکن خود زیارت کے قصد سے بار سفر نہیں باندھنا چاہیے"۔

"ابن باز" مشہور وہابی مفتی کہ جو کچھ عرصہ قبل ہی فوت ہوئے ہیں۔ الجزیرہ اخبار کے مطابق وہ یہ کہتے تھے "جو مسجد نبوی کی زیارت کرے اس کے لیے مستحب ہے کہ روضہ رسول

میں دو رکعت نماز ادا کرے اور پھر آنحضرت پر سلام کہے اور نیز مستحب ہے کہ جنت البقیع میں جا کر وہاں مدفون شہداء پر سلام کہے"(۱)

اہلسنت کے چاروں فرقے "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" کی نقل کے مطابق پیغمبر اکرم کی قبر مبارک کی زیارت کو بغیر ان قیود اور شروط کے مستحب سمجھتے ہیں۔

اس کتاب میں یوں نقل ہوا ہے "پیغمبر اکرم کی قبر کی زیارت، اہم ترین مستحبات میں سے ہے اور اس بارے میں متعدد احادیث نقل ہوئی ہیں" اس کے بعد انہوں نے چھ احادیث نقل کی ہیں۔(۲)

یہ وہابی ٹولہ اس مسئلہ میں مجموعی طور پر تین نکات میں دنیا کے باقی مسلمانوں سے زیادہ اختلاف رکھتا ہے۔

۱۔ قبروں پر تعمیر کرنا

۲۔ قبور کی زیارت کے لیے سفر کا سامان باندھنا (شد رحال)

۳۔ عورتوں کا قبروں پر جانا

انہوں نے بعض روایات کے ذریعے ان تین موارد کی حرمت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان روایات کی یا تو سند درست نہیں یا اس مطلب پر ان کی دلالت مردود ہے (انشاء اللہ عنقریب ان روایت کی تشریح بیان کی جائے گی) ہمارے خیال کے مطابق یہ لوگ تمام حرکت کے لیے کچھ اور مقصد رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ لوگ توحید و شرک والے مسئلہ وسوسے میں گرفتار ہیں۔ شاید خیال کرتے ہیں کہ قبروں کی زیارت کرنا، ان کی پوجا کرنے کے مترادف ہے اس لیے انکے علاوہ پوری دنیا کے مسلمان انکے نزدیک مشرک اور ملحد ہیں!!

---

۱) الجزیرہ اخبار شمارہ ۱۹۸۳ (۳۲۷ ذی القعدہ ۱۴۱۹ق)۔

۲) الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۱ ص ۵۹۰۔

زیارت قبول کی گذشتہ تاریخ:

گذشتہ لوگوں کی قبروں کا احترام (بالخصوص بزرگ شخصیات کی قبروں کا احترام) بہت قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ ہزاروں سال پہلے سے لوگ اپنے مردوں کا احترام کرتے تھے اور انکی قبروں اور بالخصوص بزرگان کی قبروں کی تکریم کرتے تھے۔ اس کام کا فلسفہ اور مثبت آثار بہت زیادہ ہیں۔

۱۔ گذشتہ لوگوں کی تکریم کا سب سے پہلا فائدہ، ان بزرگوں کی حرمت کی حفاظت ہے اور ان کی قدردانی انسانی عزت و شرافت کی علامت ہے۔ اسی طرح جوانوں کے لیے ان کی سیرت پر عمل پیرا ہونے کے لیے تشویق کا باعث بنتی ہے۔

۲۔ دوسرا فائدہ ان کی خاموش مگر گویا قبروں سے درس عبرت حاصل کرنا اور آئینہ دل سے غفلت کے زنگ کو دور کرکے دنیاوی زرق و برق کے مقابلے میں ہوشیاری اور بیداری پیدا کرنا ہے اور ہوا و ہوس پر قابو پانا ہے۔

جیسا کہ امیرالمؤمنینؑ نے فرمایا کہ مردے بہترین وعظ و نصیحت کرنے والے ہیں۔

۳۔ تیسرا فائدہ پسماندگان کی تسلی کا حصول ہے کیونکہ لوگ اپنے عزیزوں کی قبروں پر سکون کا احساس کرتے ہیں۔ گویا وہ انکے ساتھ ہمنشین ہیں۔ اسطرح قبروں پر جانے سے انکے دکھ کی شدت میں کمی آجاتی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ جو جنازے مفقود ہو جاتے ہیں انکے وارث انکے لیے ایک قبر کی علامت اور شبیہ بنا لیتے ہیں اور وہاں پر انہیں یاد کرتے ہیں۔

۴۔ چوتھا فائدہ یہ کہ گذشتہ شخصیات کی قبروں کی تعظیم و تکریم ہر قوم و ملت کی ثقافتی میراث کو زندہ رکھنے کا ایک طریقہ شمار ہوتی ہے اور ہر قوم اپنی قدیمی ثقافت کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔ پوری دنیا کے مسلمان ایک عظیم اور بے نیاز ثقافت رکھتے ہیں جس کا ایک اہم حصہ

شہدا، علمائے سلف اور سابقہ دانشوروں کی آرامگاہوں کی صورت میں ہے اور بالخصوص بزرگانِ دین اور روحانی پیشواؤں کے مزاروں میں نہفتہ ہے۔ ایسے بزرگوں کی قبور کی پاسداری اور ان کی حفاظت درحقیقت اسلام و سنتِ پیغمبرؐ کی حفاظت کا موجب بنتی ہے۔

وہ لوگ کتنے بے سلیقہ ہیں جنہوں نے مکہ، مدینہ اور بعض دوسرے شہروں میں بزرگانِ اسلام کے پرافتخار آثار کو محو کر کے اسلامی معاشرے کو عظیم خسارے سے دوچار کر دیا ہے۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نادان اور محدود فکر رکھنے والے سلفیوں نے نامعقول بہانوں کی آڑ میں یہ کام کر کے پیکرِ اسلام کی ثقافتی میراث پر ایسی شدید ضربیں لگائی ہیں جن کی تلافی ناممکن ہے۔

کیا یہ عظیم تاریخی آثار صرف اس ٹولے کے ساتھ مخصوص ہیں کہ اس قدر بے دردی کے ساتھ انہیں نابود کیا جا رہا ہے۔ کیا ان آثار کی حفاظت و پاسداری پوری دنیا کے اسلام سے آگاہ دانشوروں کی ایک کمیٹی کے ہاتھ میں نہیں ہونی چاہیے؟

۵۔ پانچواں فائدہ یہ کہ دین کے عظیم پیشواؤں کی قبروں کی زیارت اور بارگاہِ الٰہی میں ان سے شفاعت کا تقاضا کرنا عند اللہ، توبہ اور انابہ کے ہمراہ ہوتا ہے۔ اور یہ چیز نفوس کی تربیت، اخلاق و ایمان کی پرورش میں انتہائی موثر ہے۔ بہت سے گناہوں میں آلودہ لوگ جب ان کی بارگاہِ ملکوتی میں حاضری دیتے ہیں تو توبہ کر لیتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور جو نیک و صالح افراد ہوتے ہیں ان کے روحانی و معنوی مراتب میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

قبور کی زیارت کے سلسلہ میں شرک کا توہم:

کبھی کمزور فکر لوگ ائمہ اطہار کی قبور کے زائرین پر "شرک" کا لیبل لگا دیتے ہیں یقیناً،

اگر وہ زیارت کے مفہوم اور زیارت ناموں میں موجود مواد سے آگاہی رکھتے تو ایسی باتوں پر شرمندہ ہوتے۔

کوئی بھی عقلمند آدمی پیغمبر اکرمؐ یا آئمہؑ کی پرستش نہیں کرتا ہے۔ بلکہ یہ بات تو ان کے ذہن میں خطور بھی نہیں کرتی ہے۔ تمام آگاہ مومنین احترام اور طلب شفاعت کے لیے زیارت کو جاتے ہیں۔

ہم اکثر اوقات، زیارت نامہ پڑھنے سے پہلے سو مرتبہ "اللہ اکبر" کہتے ہیں اور اس طرح سو مرتبہ توحید کی تاکید کرتے ہیں اور شرک کے ہر قسم کے شبہ کو اپنے سے دور کرتے ہیں۔

معروف زیارت نامہ "امین اللہ" میں ہم آئمہ کی قبروں پر جا کر یوں کہتے ہیں،

"اشهد انک جاهدت فی الله حق جهاده و عملت بکتابه و اتبعت سنن نبیه حتی دعاک الله الی جواره"

"ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے راہ خدا میں جہاد کیا اور جہاد کا حق ادا کر دیا۔ کتاب خدا پر عمل کیا اور سنتِ پیغمبرؐ کی پیروی کی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس جہان سے اپنی جوارِ رحمت میں بلا لیا۔"

کیا اس سے بڑھ کر توحید ہو سکتی ہے؟

اسی طرح مشہور زیارت جامعہ کبیرہ میں ہم یوں پڑھتے ہیں کہ،

"الی الله تدعون و علیه تدلون و به تؤمنون و له تسلمون و بامره تعملون و الی سبیله

فرشلووت*

(ان چند جملوں میں سب ضمیریں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف لوٹتی ہیں، دراصل یوں کہتے ہیں) ”کہ آپ آئمہ، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے اور اس کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ اور آپ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے سامنے تسلیم ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے کی طرف رشد وہدایت کرتے ہیں“

ان زیارت ناموں میں ہر جگہ اللہ تعالیٰ اور دعوت توحید کی بات ہے کیا یہ شرک ہے یا ایمان؟ اسی زیارت نامہ میں ایک جگہ یوں کہتے ہیں

”مستشفع الی اللہ عزوجل بکم“ میں آپ کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کو طلب کرتا ہوں۔

اور اگر بالفرض زیارت ناموں کی بعض تعبیروں میں ابہام بھی ہو تو ان محکمات کی وجہ سے کا ملاً روشن ہو جاتا ہے۔

کیا شفاعت طلب کرنا توحیدی نظریات کے ساتھ سازگار ہے؟

ایک اور بڑی غلطی جس سے وہابی دوچار ہوئے ہیں یہ ہے کہ وہ بارگاہ رب العزت میں اولیاء الٰہی سے شفاعت طلب کرنے کو بتوں سے شفاعت طلب کرنے پر قیاس کرتے ہیں (وہی بت جو بے جان اور بے عقل وشعور ہیں)

حالانکہ قرآن مجید نے کئی بار بیان کیا ہے کہ انبیاء الٰہی، اسکی بارگاہ میں گناہگاروں کی شفاعت کرتے تھے۔ چند نمونے حاضر خدمت ہیں:

۱۔ برادران یوسف نے حضرت یوسف کی عظمت اور اپنی غلطیوں کو سمجھنے کے بعد حضرت

یعقوب سے شفاعت کا تقاضا کیا اور انہوں نے بھی انہیں مثبت وعدہ دیا۔

”قالوا یا ابانا استغفرلنا ذنوبنا انا کنا خاطئین، قال سوف استغفر لکم ربی انہ ھو الغفور الرحیم“(۱)

کیا (معاذ اللہ) یعقوب مشرک پیغمبر تھے؟

۲۔ قرآن مجید گنہگاروں کو توبہ اور پیغمبر اکرمؐ سے شفاعت طلب کرنے کی تشویق کرتے ہوئے یوں فرماتا ہے

”ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما“

”جب بھی وہ اگر اپنے آپ پر (گناہوں کی وجہ سے) ظلم کرتے اور آپ کی خدمت میں آتے اور توبہ کرتے اور رسولؐ بھی انکے لیے استغفار کرتے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے“(۲)

کیا یہ آیت شرک کی طرف تشویق کر رہی ہے؟

۳۔ قرآن مجید منافقین کی مذمت میں یوں کہتا ہے:

”واذا قیل لھم تعالوا یستغفر لکم رسول اللہ لووا رؤسھم ورایتھم یصدون وھم مستکبرون“(۳)

---

۱) سورہ یوسف آیات ۹۷-۹۸۔

۲) سورہ نساء آیت ۶۴۔

۳) سورہ منافقون آیت ۵

جب انہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ تا کہ رسول خدا تمہارے لیے مغفرت طلب کریں تو وہ (طنزیہ سر ہلاتے ہیں اور آپ نے دیکھا کہ وہ) حق باتوں سے بے پرواہی برتتے اور تکبر کرتے ہیں"

کیا قرآن مجید، کفار اور منافقین کو شرک کی طرف دعوت دے رہا ہے؟

۲۔ ہم جانتے ہیں کہ قوم لوط بدترین امت تھی لیکن اس کے باوجود حضرت ابراہیم جیسے عظیم الانبیاء نے ان کے بارے میں شفاعت کی (اور خداوند سے درخواست کی کہ انہیں مہلت دی جائے شاید توبہ کرلیں) لیکن یہ قوم چونکہ اپنی حد سے بڑھی ہوئی بداعمالیوں کی وجہ سے شفاعت کی قابلیت کھو چکی تھی۔ اس لیے حضرت ابراہیم کو کہا گیا کہ ان کی شفاعت سے صرف نظر کیجئے۔

"فلما ذهب عن ابراهيم الروع وجاءته البشرى يجادلنا في قوم لوط، ان ابراهيم لحليم اواه منيب يا ابراهيم اعرض عن هذا انه قد جاء امر ربك وانهم آتيهم عذاب غير مردود" (۱)

"جس وقت ابراہیم کا خوف (اجنبی فرشتوں کی وجہ سے) ختم ہوگیا اور (بیٹے کی ولادت کی) بشارت انہیں مل گئی تو قوم لوط کے بارے میں ہم سے گفتگو کرنے لگے (اور شفاعت کرنے لگے) کیونکہ ابراہیم بردبار، دلسوز اور توبہ کرنے والے تھے (ہم نے ان سے کہا) اے ابراہیم اس (درخواست) سے صرف نظر کیجئے کیونکہ آپ کے پروردگار کا فرمان پہنچ چکا ہے اور یقینی طور پر ناقابل رفع عذاب ان کی طرف آئیگا"

۱۔ سورہ ہود آیت ۷۴ تا ۷۶۔

عجیب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اس شفاعت کے مقابلے میں حضرت ابراہیم کی عجیب تمجید فرمائی اور کہا "ان ابراهيم لحليم اواه منيب" لیکن اس مقام پر انہیں تذکر دیا ہے کہ پانی سر سے گزر چکا ہے اور شفاعت کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

اولیاء الٰہی کی شفاعت انکی ظاہری زندگی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

بہانہ تلاش کرنے والے جب ایسی آیات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن میں صراحت کے ساتھ انبیائے الٰہی کی شفاعت کی قبولیت کا تذکرہ ہے اور ان آیات کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے تو پھر ایک اور بہانہ بناتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ یہ آیات انبیاء کرام کی زندگی کے ساتھ مربوط ہیں۔ ان کی وفات کے بعد شفاعت پر کوئی دلیل نہیں ہے اس طرح ترک والی شاخ کو چھوڑ کر دوسری شاخ کو پکڑتے ہیں۔

لیکن اس جگہ یہ سوال سامنے آئیگا کہ کیا پیغمبر اکرمؐ اپنی رحلت کے بعد خاک میں تبدیل اور مکمل طور پر نابود ہو گئے ہیں یا حیات برزخی رکھتے ہیں؟ (جس طرح بعض وہابی علماء نے ہمارے سامنے اس بات کا اقرار کیا ہے)

اگر حیات برزخی نہیں رکھتے تو اولیا پیغمبر اکرم کا مقام شہداء سے کم ہے جن کے بارے میں قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ "بل احياء عند ربهم يرزقون" (۱)

ثانیاً تمام مسلمان نماز کے تشہد میں آنحضرتؐ پر سلام بھیجتے ہیں اور یوں کہتے ہیں "السلام عليك ايها النبي" اگر آنحضرتؐ موجود نہیں ہیں تو کیا یہ کسی خیالی شے کو سلام کیا جاتا ہے؟

۱) سورہ آل عمران آیت ۱۶۹۔

ثالثاً کیا آپ معتقد نہیں ہیں کہ مسجد نبوی میں پیغمبر اکرمؐ کے مزار کے قریب آہستہ بولنا چاہیے کیونکہ قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ "یا ایھا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی" (۱) اور اس آیت کو تحریر کرکے آپ لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ کی ضریح پر نصب کیا ہوا ہے؟

ہم ان متضاد باتوں کو کیسے قبول کریں!

رابعاً موت نہ فقط زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ ایک نئی ولادت اور زندگی میں وسعت کا نام ہے۔ "الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا" (۲) لوگ غفلت میں ہیں جب مریں گے بیدار ہوں گے۔

خامساً ایک معتبر حدیث میں جسے اہلسنت کی معتبر کتب میں ذکر کیا گیا ہے۔ عبداللہ بن عمر نے رسول خداؐ سے یوں نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "من زار قبری وجبت له شفاعتی" (۳) جس نے میری قبر کی زیارت کی اسکے لیے میری شفاعت یقینی ہوگی۔

ایک اور حدیث میں یہی راوی پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتا ہے "من زارنی بعد موتی فکانما زارنی فی حیاتی" (۴) جس نے میری رحلت کے بعد میری زیارت کی وہ ایسا ہی

۱) سورۂ حجرات آیت ۲۔ اے صاحبان ایمان اپنی آواز کو نبی کی آواز سے بلند نہ کیجیے۔
۲) عوالی اللئالی، جلد ۴ ص ۷۳۔
۳) دار قطنی مشہور محدث نے اس حدیث کو اپنی کتاب "سنن" میں نقل کیا ہے (جلد ۲ ص ۲۷۸) [illegible] علامہ امینی نے اسی حدیث کو اہلسنت کی ۴۱ مشہور کتابوں سے نقل کیا ہے ملاحظہ فرمائیں الغدیر جلد ۵ ص ۹۳۔
۴) (سابقہ مدرک) علامہ امینی نے اس حدیث کو ۱۳ کتابوں سے نقل کیا ہے۔

ہے جیسے اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی ہو"

لہذا حیات اور ممات کے درمیان فرق ڈالنا صرف ایک موہوم خیال ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس حدیث کے اطلاق سے یہ بھی بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کی قبر کی زیارت کے قصد سے "شد رحال" سامان باندھنے اور سفر کرنے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

خواتین اور قبور کی زیارت

خواتین زیادہ عطوفت اور رقت قلب کی وجہ سے اپنے عزیزوں کی قبروں پر جانے کی زیادہ ضرورت محسوس کرتی ہیں تاکہ انہیں صبر و تسلی حاصل ہو سکے۔ اور تجربے کے ذریعے یہ بات ثابت ہے کہ اولیاء الٰہی کی قبور کی زیارت کے لیے بھی وہ زیادہ مشتاق ہوتی ہیں۔

لیکن مقام افسوس ہے کہ یہ وہابی ٹولہ ایک مشکوک حدیث کی خاطر، خواتین کو ان قبور کی زیارت سے شدت سے منع کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جنوب ایران میں انکی عوام کی زبانوں پر یہ بات مشہور ہے کہ اگر کوئی عورت کسی کی قبر پر جائے تو وہ مردہ اس خاتون کو بالکل برہنہ حالت میں دیکھتا ہے!

ایک عالم کہہ رہے تھے میں نے وہابیوں سے کہا کہ پیغمبر اکرمؐ اور خلیفۂ اوّل و دوّم کی قبریں حضرت عائشہ کے کمرے میں تھیں اور وہ کافی عرصہ تک اسی کمرہ میں رہتی رہیں یا کم از کم اس کمرہ میں آمد و رفت رکھتی تھیں۔

بہرحال (خواتین کے لیے زیارت قبور کی حرمت پر) ان کے پاس دلیل کے طور پر ایک مشہور حدیث ہے جسے وہ رسول خداؐ کی طرف نسبت دیتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "لعن الله زائرات القبور" "اللہ تعالیٰ قبروں کی زیارت کرنے والی خواتین پر لعنت کرے"

بعض کتابوں میں "زائرات" کے لفظ کی بجائے "زوّارات القبور" نقل کیا گیا ہے کہ جو مبالغہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اہلسنت کے بعض علماء جیسے ترمذی ( ) وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس زمانے کے ساتھ مخصوص ہے جب آنحضرتؐ نے اس بات سے منع فرمایا تھا۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا تھا اور آپؐ نے اجازت فرما دی تھی

بعض دیگر علماء کہتے ہیں کہ یہ حدیث ان خواتین کے ساتھ مخصوص ہے جو اپنا زیادہ وقت زیارت قبور کے لیے صرف کرتی تھیں اور اس طرح انکے شوہروں کے حقوق ضائع ہوتے تھے اور لفظ "زوّارات" [illegible] کہ جو مبالغے کا صیغہ ہے اس بات کی دلیل ہے۔

یہ برادران چاہے سب چیزوں کا انکار کردیں لیکن حضرت عائشہ کے کام کا تو انکار نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ پیغمبر اکرمؐ اور پہلے و دوسرے خلیفہ کی قبریں انکے گھر میں تھیں اور وہ ہمیشہ ان قبروں کے نزدیک تھیں۔

"شدّ رحال" فقط تین مساجد کے لیے!

تاریخ اسلام میں صدیوں سے مسلمان، پیغمبر اکرمؐ اور بزرگان بقیع کی قبور کی زیارت کے لیے شدّ رحال کرتے تھے (یعنی اس زیارت کے قصد سے سامان باندھتے) اور سفر کرتے تھے اور کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔

۱) سنن ترمذی، جلد ۳، ص ۳۷۱ (انہوں نے باب کا عنوان یہ رکھا ہے "باب ما جاء من الرخصة فی زیارة القبور" یعنی وہ باب جس میں زیارت قبور کی اجازت دی گئی ہے۔

یہاں تک کہ ساتویں صدی میں ابن تیمیہ کا زمانہ آیا اور اس نے اپنے پیروکاروں کو اس بات سے منع کیا اور کہا کہ "شدّ رحال" صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے جائز ہے اور دوسری مسجدوں کے لیے حرام ہے، اور اس دعوے میں دلیل کے طور پر ابوہریرہ کی اس حدیث کو نقل کیا کہ ابوہریرہ نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا

"لا تشد الرحال الا الیٰ ثلاثة مساجد، مسجدی هذا و مسجد الحرام و مسجد الاقصی" (۱)

صرف تین مساجد کے لیے رخت سفر باندھا جاتا ہے ایک میری مسجد اور دوسری مسجد الحرام اور تیسری مسجد الاقصیٰ (۱)

حالانکہ اولاً اس حدیث کا موضوع مساجد کے ساتھ مخصوص ہے نہ دوسرے مقامات کی زیارت کے ساتھ۔ لہٰذا اس حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ تین مساجد کے علاوہ دیگر مسجدوں کے لیے سامان سفر نہیں باندھا جاتا ہے۔

ثانیاً یہ حدیث ایک اور طرح بھی نقل ہوئی ہے اور اس نقل کے مطابق انکے مقصود پر دلالت نہیں کرتی ہے وہ اس طرح کہ "تشد الرحال الی ثلاث مساجد" تین مساجد کے لیے سامان سفر باندھا جاتا ہے" (۱) اور یہ درحقیقت اس کام پر تشویق کرتا ہے۔ اس تشویق سے دوسرے مقامات کی زیارت کی نفی نہیں ہوتی ہے کیونکہ ایک شے کے ثابت کرنے سے دوسری شے کی نفی نہیں ہوتی۔ اور چونکہ معلوم نہیں ہے کہ اصل حدیث کا متن پہلی طرح یا دوسری طرح تھا اس لیے حدیث مجمل ہو جائیگی اور استدلال کے قابل نہیں رہے گی۔

۱) صحیح مسلم، جلد ۴، ص ۱۲۶
۲) مصدر سابق۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ اسی کتاب میں دوسرے مقام پر یوں نقل کیا گیا ہے کہ "لا تسافروا الی ثلاثة مساجد" سفر صرف تین مساجد کے لیے جائز ہے"

لہٰذا، شد رحال صرف تین مساجد کے لیے جائز ہے!

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ اولاً امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ بہت سے دینی اور غیر دینی سفر مختلف مقاصد کے لیے جائز ہیں۔ سفر صرف تین مساجد کے لیے منحصر نہیں ہے لہٰذا یہ حصر اصطلاحاً "حصر اضافی" ہے یعنی مساجد میں سے یہ تین مسجدیں ہیں جن کے لیے شد رحال کیا جاتا ہے۔ ثانیاً حدیث کا متن مشکوک ہے معلوم نہیں ہے کہ پہلا متن درست ہے یا دوسرا یا تیسرا۔ اور یہ احتمال بعید ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اس مطلب کو تین مرتبہ مختلف الفاظ میں بیان کیا ہو۔ ظاہراً ایسا لگتا ہے کہ راویوں نے نقل بہ معنی کیا ہے لہٰذا اس حدیث میں ابہام پایا جاتا ہے اور جب کسی حدیث کا متن مبہم ہو تو اس کے ساتھ کیا گیا استدلال معتبر نہیں ہوتا ہے۔

کیا قبور پر عمارت بنانا ممنوع ہے؟

صدیوں سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ مسلمان بزرگان اسلام کی قبور پر تاریخی عمارتیں تعمیر کرتے تھے اور ان کی قبور کی زیارت کے لیے آتے اور ان سے تبرک حاصل کرتے تھے اور اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا۔ حقیقت میں اس عمل پر مسلمانوں کا اجماع قائم تھا اور سیرت عملی کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں تھا۔

مورخین نے تاریخ میں جیسے مسعودی نے مروج الذہب میں (کہ جنہوں نے چوتھی صدی میں زندگی گذاری ہے) اور سیاحوں جیسے ابن جبیر اور ابن بطوطہ نے ساتویں اور آٹھویں صدی میں اپنے سفرناموں میں اس قسم کی عظیم عمارتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

---

۱) صحیح مسلم ج ۳ ص ۱۲۶۔

یہاں تک کہ ساتویں صدی میں ابن تیمیہ اور بارہویں صدی میں انکے شاگرد محمد ابن عبد الوہاب پیدا ہوئے اور انہوں نے قبور پر ان عمارتوں کو بدعت، شرک اور حرام قرار دیا۔

انہوں کے پاس چونکہ سادہ مسائل کی تحلیل کے لیے علمی قدرت کم تھی اس لیے یہ لوگ توحید اور شرک کے مسئلہ میں وسواس کا شکار ہو گئے۔ انہیں جہاں بھی کوئی دستاویز ملی اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی لیے زیارت، شفاعت، قبروں پر عمارات اور دیگر مسائل کو انہوں نے شریعت کے خلاف شمار کرتے ہوئے شرک اور بدعت کے ساتھ تعبیر کیا۔ اور ان میں سے اہم ترین مسئلہ بزرگان دین کی قبروں پر تعمیرات کرانے کا مسئلہ ہے آج کل سوائے حجاز کے پوری دنیا میں سابقہ انبیاء اور بزرگان دین کی قبور پر عظیم تاریخی عمارتیں موجود ہیں جو بہت سی تاریخی یادوں کو تازہ کرتی ہیں۔

مصر سے لیکر ہندوستان تک اور افریقہ سے لیکر انڈونیشیا تک سب لوگ اپنے ملک میں موجود اسلامی آثار کا احترام کرتے ہیں اور بزرگان دین کی قبروں کے لیے ایک خاص اہمیت کے قائل ہیں۔ لیکن حجاز میں ایسی بات نظر نہیں آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اسلامی مفاہیم کی صحیح تحلیل نہیں کر پائے ہیں۔

وہابیت کے ہاتھوں ثقافتی میراث کی نابودی

گذشتہ صدی میں سرزمین وحی پر یک تلخ واقعہ رونما ہوا جس نے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے اسلامی تاریخ کے آثار سے محروم کردیا۔ وہ حادثہ وہابیت کا برسر اقتدار آنا تھا۔ تقریباً اسی (۸۰) سال پہلے (۱۳۴۴ھ ق) جب حجاز کی حکومت وہابیت کے ہاتھوں آئی تو انہوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت تمام اسلامی تاریخ کی عمارتوں کو شرک یا بدعت کے بہانے سے

ویران کر کے خاک کے ساتھ یکساں کر دیا۔

البتہ کسی کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ پیغمبر گرامی اسلام کی قبر مطہر کو خراب کریں، اس خوف سے کہ کہیں پوری دنیا کے مسلمان انکے خلاف اٹھ کھڑے نہ ہوں اور حقیقت میں ان مخالفین نے دوسرے سب مسلمانوں سے تقیہ کیا!

مکہ مکرمہ کے بعض سفروں کے دوران ہم نے دوستانہ ماحول میں وہابیت کے بڑے ... سے یہ دریافت کیا کہ آپ نے سوائے روضۂ رسولؐ کے باقی سب قبور کو ویران کر دیا ... کے باقی رکھنے کا راز کیا ہے؟ تو اس سوال کے جواب میں انکے پاس کوئی عذر وبہانہ نہ ...

بہرحال قوموں کی حیات مختلف امور کے ساتھ وابستہ ہے جن میں سے ایک انکی ... میراث اور اپنے دینی وعلمی آثار کی حفاظت ہے۔ جبکہ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا ... کہ سرزمین وحی بالخصوص مکہ اور مدینہ میں مسلمانوں کی غلط تدبیر کی وجہ سے ایک ... ذہنیت رکھنے والے کج سلیقہ اور متعصب ٹولے نے اسلام کی انتہائی قیمتی میراث ... بہانوں کے ذریعہ برباد کر دیا ہے۔ ایسی میراث جس کی ہر ایک عمارت اسلام کی ... کو یاد دلاتی تھی۔

صرف آئمہ طاہرین اور جنت البقیع میں مدفون دوسرے بزرگوں کی قبروں کو ویران ... گیا بلکہ اس ٹولے نے جہاں بھی کہیں اسلامی تاریخ کا کوئی اثر پایا اسے ویران کر دیا ... سے ایک بہت بڑا ناقابل تلافی خسارہ مسلمانوں کے دامن گیر ہوا۔

یہ تاریخی آثار ایک عجیب جاذبیت رکھتے تھے۔ اور انسان کو اسلامی ... گہرائیوں سے آشنا کرتے تھے۔ جنت البقیع ایک وقت انتہائی باعظمت جلوہ رکھتا ... ہر گوشہ ایک اہم تاریخی حادثہ کی یاد دلاتا تھا لیکن آج ایک ویران بیابان میں تبدیل ...

ہو جاتی عجیب لگتا ہے اور وہ بھی بڑے بڑے خوبصورت ہوٹلوں اور زرق برق والی عمارتوں کے درمیان اور زیادہ عجیب لگتا ہے۔ اس کے لوہے کی سلاخوں کے دروازے صرف ایک دو گھنٹے کے لیے وہ بھی فقط مرد زائرین کیلئے کھولے جاتے ہیں۔

بہانے:

ا۔ قبروں کو مسجد نہیں بنانا چاہیے:

بعض کہتے ہیں کہ قبروں پر عمارت بنانا انکی پرستش کا باعث بنتا ہے۔ اور نبی اکرمؐ کی یہ حدیث اس کے جائز نہ ہونے پر دلیل ہے "لعن اللہ الیھود اتخذوا قبور انبیائھم مساجد" "اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر لعنت کی ہے کیونکہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا تھا" ( )

سب مسلمانوں پر واضح ہے کہ کوئی بھی اولیائے الٰہی کی قبروں کی پوجا نہیں کرتا ہے۔ اور زیارت اور عبادت کے درمیان واضح فرق ہے۔ ہم جس طرح زندہ لوگوں کی زیارت و ملاقات کے لیے جاتے ہیں بزرگوں کا احترام کرتے ہیں اور ان سے التماس دعا کرتے ہیں ایسے ہی مردوں کی زیارت کے لیئے بھی جاتے ہیں اور بزرگان دین اور شہداء فی سبیل اللہ کا احترام کرتے ہیں اور ان سے التماس دعا کہتے ہیں۔

کیا کوئی بھی عاقل یہ کہتا ہے کہ زندگی میں بزرگوں کی زیارت اس طرح کرنا جس طرح کرتا آیا ہے عبادت یا کفر و شرک ہے؟ مرنے کے بعد بھی انکی زیارت اسی طرح ہے۔

۱۔ صحیح بخاری جلد [illegible] ... حدیث "و النصاریٰ" کے لفظ کے اضافے کے ساتھ صحیح مسلم میں بھی آئی ہے (جلد ۲، ص ۶۷)۔ [illegible]

پیغمبر اکرمؐ جنت البقیع میں قبروں کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے اور کتب اہلسنت میں بھی بہت سی روایات پیغمبر اکرمؐ کی قبر اور دیگر قبور کی زیارت کے بارے میں ذکر ہوئی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر لعنت کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ (سجدہ کا مقام) قرار دیا تھا۔ جبکہ کوئی بھی مسلمان کسی قبر کو اپنا سجدہ کا مقام قرار نہیں دیتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آج بھی پیغمبر اسلام کا روضہ مبارک، مسجد نبوی کے ساتھ موجود ہے اور تمام مسلمان حتیٰ کہ وہابی بھی اس روضہ مقدسہ (مسجد نبوی کے اس حصے میں جو آنحضرت کی قبر مبارک سے متصل ہے) کے ساتھ پانچ وقت واجب نمازیں اور اس کے علاوہ مستحب نمازیں پڑھتے ہیں اور آخر میں پیغمبر اکرمؐ کی قبر کی زیارت کرتے ہیں۔ کیا یہ کام قبروں کی پوجا شمار ہوتا ہے اور حرام ہے؟ یا یہ کہ پیغمبر اکرمؐ کی قبر اس حرمت سے مستثنیٰ ہے؟ کیا غیر خدا کی پوجا کی حرمت کی دلیلیں بھی قابل استثناء ہیں؟!

یقیناً قبروں کی زیارت انکی عبادت شمار نہیں ہوتی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی قبر مبارک کے ساتھ یا دیگر اولیاء الٰہی کی قبروں کے نزدیک نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور مذکورہ بالا حدیث ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو واقعاً قبروں کی پوجا اور پرستش کرتے تھے۔ جو لوگ شیعوں کی اپنے آئمہ اطہار کی قبور کی زیارت کے ساتھ آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب واجب نمازوں کے اوقات میں مؤذن اذان دیتا ہے تو سب رو بہ قبلہ کھڑے ہو کر ان نمازوں کو جماعت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اور زیارت کرتے وقت سب سے پہلے سو مرتبہ تکبیر کہتے ہیں اور زیارت کے بعد دو رکعت نماز زیارت رو بہ قبلہ انجام دیتے ہیں تاکہ ابتداء و انتہاء میں روشن ہو جائے کہ پرستش صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ کچھ خاص مقاصد کی خاطر تہمت، افتراء اور جھوٹ کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں اور وہابی حضرات جو کہ اقلیت میں ہیں اپنے تمام مخالفین پر قسم قسم کی تہمتیں لگاتے ہیں۔ انکی باتوں کی بہترین توجیہ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ یہ لوگ کم علمی کی وجہ سے مسائل کی درست تحلیل نہیں کر سکتے اور توحید و شرک کی حقیقت کو خوب سمجھ نہیں پائے ہیں اور انہیں عبادت و زیارت میں واضح طور پر فرق معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

۲۔ ایک اور بہانہ:

صحیح مسلم سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ ابو الہیاج نے پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح حدیث نقل کی ہے

"قال لی علی ابن ابی طالب الا ابعثک
علی ما بعثنی علیه رسول الله ان لا تدع تمثالا
الا طمسته و لا قبرا مشرفا الا سوّیته" (۱)

"حضرت علیؑ نے مجھے فرمایا کیا تجھے وہ ذمہ داری سونپوں جو مجھے رسول خداؐ نے سونپی تھی کہ جہاں (ذی روح) کی تصویر دیکھو مٹا دو اور جہاں کہیں ابھری ہوئی قبر دیکھو اسے صاف کر دو"

اس حدیث سے غلط مفہوم نکالنے کی وجہ سے بعض لوگوں نے بیلچے اٹھائے اور تمام بزرگان دین کی قبریں ویران کر دیں۔ صرف پیغمبر اکرمؐ اور پہلے دو دوسرے خلیفہ کی قبریں باقی رہنے دیں۔ گویا ایسے استثناء کے قائل ہوئے جس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

(۱) صحیح مسلم جلد ۳، ص ۶۱، یہ روایت اہلسنت کے بعض دیگر مصادر میں بھی نقل ہوئی ہے۔

لیکن ولا اس حدیث کی سند میں کئی افراد ایسے ہیں جو رجال اہلسنت کے مطابق بھی موردِ تائید نہیں ہیں اور ان میں سے بعض دھوکہ وفریب دینے والے شمار ہوتے ہیں جیسے بالخصوص "سفیان ثوری" اور "ابن ابی ثابت"

ثانیاً بالفرض اگر یہ حدیث صحیح ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ قبر کی پشت صاف ہونی چاہیے (مچھلی کی پشت کی طرح، ابھری ہوئی نہیں ہونی چاہیے جیسا کہ کفار کی رسم تھی) اور بہت سے اہل سنت فقہاء نے فتویٰ دیا ہے کہ قبر کی پشت صاف اور مسطح ہونی چاہیے اور یہ بات مذکورہ بحث کے ساتھ مربوط نہیں ہے۔

ثالثاً فرض کر لیتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ قبر زمین کے ساتھ ہم سطح ہونی چاہیے اور بالکل اُبھری ہوئی نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن اس مسئلہ کا قبروں پر عمارت بنانے سے کیا تعلق ہے؟ فرض کیجیے پیغمبر اکرم کی قبر مبارک کا پتھر زمین کے ساتھ ہم سطح اور اس کے ساتھ ساتھ روضہ گنبد اور بارگاہ جو آجکل موجود ہے یہ بھی باقی ہو ان دونوں کے درمیان کیا منافات ہے؟

جسطرح قرآن مجید میں پڑھتے ہیں کہ جس وقت اصحاب کہف کا راز فاش ہو گیا تو لوگوں نے کہا کہ ان کی قبروں پر عمارت بنائیں گے۔ قرآن مجید یوں فرماتا ہیں "قال الذین غلبوا علی أمرهم لنتخذن علیهم مسجداً" جو لوگ انکے واقعہ سے آشنا تھے کہنے لگے ان کے مقام پر مسجد بنائیں گے۔(۱)

قرآن مجید نے مثبت انداز میں اس داستان کو نقل کیا اور اس پر اعتراض نہیں کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بزرگاں کی قبروں کے ساتھ مسجد بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۱) سورۂ کہف آیت ۲۱۔

بزرگانِ دین کی قبور کی زیارت کے مثبت آثار

اگر لوگوں کو صحیح تعلیم دی جائے کہ ہر قسم کے افراط وتفریط سے پرہیز کرتے ہوئے ان مزاروں کے پاس یادِ خدا میں رہیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہوئے اولیائے الٰہی کی افکار سے الہام لیں تو یقیناً یہ قبریں تعلیم وتربیت کا مرکز اور اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ اور تہذیب نفوس کا محور بن جائیں گی۔

یہ بات ہمارے لیے تجربہ شدہ ہے کہ ہر سال آئمہ طاہرین اور شہدائے راہِ حق کی قبور کی زیارت کو جانے والے، مخلص زائرین، بہتر جذبہ، نورانی، صاف اور پاکیزہ دل کے ساتھ واپس آتے ہیں اور اس زیارت کی نورانیت، کافی عرصہ تک انکے عمل سے نمایاں ہوتی ہے۔ اور جب یہ لوگ ان بزرگاں کو درگاہِ رب العزت میں شفاعت کے لیے پکارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی توبہ اور دینی ودنیوی حاجات طلب کرتے ہیں تو روحانی اور معنوی رابطہ برقرار کرنے کی خاطر انکے لیے ضروری ہوتا ہے کہ تمام گناہوں سے دوری اختیار کریں اور نیکی وپاکی کے راستے پر چلیں۔ اسطرح یہ توسل انکی نیکی کا باعث بنتا ہے۔

علاوہ بر این بزرگاں کی طرف یہ توجہ اور توسل اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان سے شفاعت طلب کرنا انسان کو مشکلات کے مقابلے میں ہمت بندھاتا ہے اور مایوسی وناامیدی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے اور اس کے جسمانی اور روحانی درد وغم کا مداوا بنتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی برکتوں کا موجب بنتا ہے۔

ہم زیارت، شفاعت اور توسل والے مسائل میں کج فہمی کی وجہ سے کیوں لوگوں کو ان روحانی وجسمانی اور معنوی برکتوں سے محروم کریں؟ کونسی عقل سلیم اس بات کی اجازت دیتی

ہے؟ ان روحانی و معنوی منزلوں کو طے کرنے سے روکنا عظیم خسارے اور نقصان کا موجب ہے گا۔ لیکن کیا کریں افسوس یہ ہے بعض لوگوں کے توحید و شرک کے مسئلہ میں بے جا وہم نے بہت سے لوگوں کو اس عظیم فیض سے محروم کر دیا ہے۔

۲: تبرک کو چاہنا اور طلب کرنا ممنوع ہے۔

بہانہ دیگر، جو لوگ بزرگان کی قبروں کی زیارت کے لیے جاتے ہیں اور ان قبور سے متبرک ہوتے ہیں اور کبھی قبر یا ضریح کو چومتے ہیں۔ اس سے شرک کی بو آتی ہے۔ اس لیے حاجی صاحبان نے دیکھا ہوگا کہ پیغمبر اکرمؐ کی قبر مبارک کے نزدیک ہر طرف سخت سپاہی کھڑے ہوتے ہیں اور نبیؐ کے عاشقوں کو ان کی ضریح اور قبر مطہر کی طرف کھلنے والی جالی کے نزدیک جانے سے روکتے ہیں۔ کبھی اس حرمت کو "ابن تیمیہ" اور "محمد ابن عبدالوہاب" کی طرف نسبت دیتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ دو افراد کہ جو وہابیت کے بانی ہیں رسولؐ کے زمانے میں ہوتے اور صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے موقع پر اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جب آنحضرتؐ وضو کرتے تو اصحاب کرام ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر وضو کا پانی لینے کی کوشش کرتے تاکہ ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرے(۱)

ایسا منظر دیکھ کر گر یہ افراد زبان سے اعتراض نہ کر سکتے تو دل ہی دل میں ضرور کڑھتے اور یوں کہتے کہ یہ کام پیغمبر اکرمؐ اور صحابہ کرام کی شان کے مطابق نہیں ہے اس سے تو شرک کی بو آتی ہے!

۱) یہ مسئلہ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں کئی مرتبہ وقوع پذیر ہوا (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۹۴۳ اور کنز العمال جلد ۱۶ ص ۱۳۹ کی طرف رجوع کیا جائے)۔

اور یا اگر یہ لوگ نبی اکرمؐ کی رحلت کے بعد مدینہ میں ہوتے تو اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ آنحضرتؐ کے سب سے پہلے میزبان جناب ابو ایوب انصاری قبر مبارک پر منہ رکھ کے تبرک حاصل کرتے تھے۔(۱) یا حضرت بلال مؤذن آنحضرتؐ کی قبر کے نزدیک بیٹھ کر شدید گریہ کرتے تھے اور شدت غم کی وجہ سے اپنا چہرہ قبر مبارک پر رگڑتے تھے۔(۲) وہابی حضرت بلال اور ابو ایوب انصاری کا گریبان پکڑ کر نہیں دور دھکیلتے کہ یہ کام شرک ہے۔ وہی کام کہ جو آجکل اس کتب کے پیروکار رسول خداؐ کے زائرین کے ساتھ کرتے ہیں۔

حالانکہ تبرک حاصل کرنے کا پرستش و پوجا کے ساتھ ذرہ بھر بھی کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس تبرک کا مطلب ایک قسم کا احترام و ادب ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ جس خدا نے اپنے رسولؐ کو مبعوث فرمایا ہے اس ادب و احترام کی خاطر زیارت کرنے والے پر اپنی رحمت و برکت نازل فرمائے۔

علمائے اسلام کی اہم ذمہ داری:

اس وجہ سے کہ عوام الناس کے بعض کاموں کی وجہ سے مخالفین کو بہانہ مل جاتا ہے اس لیے تمام علمائے اعلام اور دانشمند حضرات کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ عوام کو پیغمبر اکرمؐ، آئمہ بقیع اور دیگر آئمہ اطہار و شہدائے اسلام کی قبور مبارکہ کے نزدیک غیر سنجیدہ حرکات کرنے سے روکیں اور انہیں زیارت، توسل، تبرک اور شفاعت کے حقیقی مفہوم کی تعلیم دیں۔

۱) مستدرک حاکم، جلد ۴ ص ۵۱۵۔
۲) تاریخ ابن عساکر، جلد ۷ ص ۱۳۷۔

تمام لوگوں پر یہ واضح کر دیں کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اور وہی ذات مسبّب الاسباب، قاضی الحاجات، کاشف الکربات اور کافی المہمات ہے۔ اگر ہم پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اطہار کے ساتھ توسل کرتے ہیں تو یہ ذوات مقدسہ بھی اذن پروردگار اور اسی کی مدد کے ساتھ ہر کام انجام دیتے ہیں۔ یہ اس کے حضور ہماری شفاعت اور اس سے ہماری حاجات کے بر آنے کا تقاضا کرتے ہیں۔

عوام میں سے بعض لوگوں کا ان قبور مقدسہ کے سامنے سجدہ کرنا یا ایسے جملے ادا کرنا جن سے ان کی الوہیت کی بو آتی ہو یا ضریح پر کسی چیز سے گرہ لگانا وغیرہ یہ تمام ناشائستہ امور ہیں ان سے مشکل ایجاد ہوتی ہے۔ اور ایک مثبت اور انتہائی تعمیری کام (زیارت) کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے اور مخالفوں کو بہانہ مل جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کو زیارت کی برکتوں سے محروم کر دیتے ہیں۔

۵

نکاح موقت

(مُتعہ)

تو علمائے اسلام اس بات کے قائل ہیں کہ متعہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں ایک مدت تک رہا تھی۔ ایک گروہ قائل ہے کہ یہ خلیفہ ثانی کے دور میں خود اس کے توسط سے اور دوسرا گروہ قائل ہے کہ خود پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں متعہ کو دوبارہ حرام کردیا گیا تھا۔ اور ہم مکتب اہلبیتؑ کے پیروکاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ متعہ ہرگز حرام نہیں ہوا ہے اور اس کا جواز باقی ہے (البتہ مخصوص شرائط کے ساتھ)

اس عقیدہ میں بہت کم اہلسنت ہمارے ساتھ متفق ہیں جبکہ انکی اکثریت اس مسئلہ میں ہم سے مخالف ہے۔ بلکہ ہمیشہ ہمیں اس بات کا طعنہ دیتے اور اعتراض کرتے ہیں حالانکہ اس مسئلہ میں نہ صرف اعتراض کا مقام نہیں بلکہ یہ بہت سی اجتماعی مشکلات کے حل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اس مطلب کی وضاحت آئندہ ابحاث میں بیان کی جائیگی۔

ضرورت اور نیاز

بہت سے لوگ (بالخصوص جوان لوگ) دائمی نکاح اور شادی کی قدرت نہیں رکھتے ہیں کیونکہ عام طور پر شادی کرنے کے لیئے مقدمات، اخراجات اور بہت سی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک بڑی تعداد کے لیے شرائط ابھی آمادہ اور میسر نہیں ہیں۔

مثال کے طور پر:

۱۔ بہت سے جوان تعلیمی دور میں شادی کرنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں (بالخصوص ہمارے زمانے میں تو تعلیمی دورانیہ طولانی ہو چکا ہے) کیونکہ نہ تو ان کی کوئی ملازمت وغیرہ ہے اور نہ ہی رہائش کے لیے کوئی مناسب مکان اور نہ دیگر اخراجات، جس قدر بھی سادگی کے ساتھ شادی کرنا چاہیں پھر بھی بنیادی وسائل فراہم نہیں ہیں۔

۲۔ بعض افراد شادی شدہ ہیں لیکن بیرون ممالک سفر پر جاتے ہیں اور لمبے سفر پہ ہوتے ہیں۔ وہاں وہ جنسی محرومیت کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ نہ تو اپنی بیویوں کو ساتھ لے جا سکتے ہیں اور نہ ہی اس ملک میں دوسری شادی کر سکتے ہیں۔

۳۔ بعض لوگ ایسے ہیں جنکی بیویاں مختلف بیماریوں یا مشکلات کا شکار ہو جاتی ہیں اور اس وجہ سے وہ اپنے شوہروں کی جنسی خواہشات کو پورا نہیں کر سکتی ہیں۔

۴۔ بہت سے فوجی ایسے ہیں جو سرحدوں وغیرہ کی حفاظت کے لیے پاسبانی اور مناسبت سے لمبی ڈیوٹی پر اپنے گھر سے دور چلے جاتے ہیں اور وہاں جنسی مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور جیسے کہ آئندہ بیان کیا جائیگا پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں بھی بہت سے اسلامی فوجیوں کے لیے یہی مشکل پیش آئی اور اسی وجہ سے متعہ کو حلال کیا گیا۔

۵۔ بعض اوقات حمل کے دوران یا بعض دیگر وجوہات کی بناء پر انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ جنسی روابط ترک کر دے اور ممکن ہے شوہر جوان بھی ہو اور اس محرومیت میں گرفتار رہے۔

اس قسم کی اجتماعی ضروریات اور مشکلات ہمیشہ تھیں اور ہمیشہ رہیں گی اور یہ مسائل صرف

پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہمارے زمانے میں تحریک جنسی کے عوامل کی زیادتی کی وجہ سے یہ مسائل شدت اختیار کر چکے ہیں۔

ایسے موقع پر لوگوں کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو معاذ اللہ بدکاری اور گناہوں میں آلودہ ہو جائیں یا ایک سادہ سے نکاح یعنی متعہ سے استفادہ کریں کیونکہ اس میں شادی کی مشکلات و مسائل بھی نہیں ہیں اور دوسری طرف یہ وقتی طور پر انسان کی جنسی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ پارسائی کا مشورہ دینا اور دونوں راستوں سے چشم پوشی کرنا اگرچہ اچھا مشورہ ہے لیکن بہت سے مقامات پر قابل عمل نہیں ہے اور کم از کم بعض افراد کیلئے صرف ایک خیالی راستہ ہے۔

نکاح مسیار:

دلچسپ بات یہ ہے کہ حق متعہ کے منکر علماء (یعنی اکثر اہلسنت برادران) جب جوانوں اور دیگر محروم لوگوں کی طرف سے دباؤ کا شکار ہوئے تو وہ تدریجاً ایک نکاح کے قائل ہو گئے جو متعہ کے مشابہ ہے اور اسے وہ "ازدواج مسیار" کا نام دیتے ہیں۔ گرچہ اس نکاح کا نام نکاح موقت یعنی متعہ نہیں ہے لیکن عمل میں یہ متعہ کے ساتھ کوئی فرق نہیں کرتا ہے۔

یعنی اس طرح وہ علماء بھی اجازت دیتے ہیں کہ ایک ضرورت مند انسان اس عورت کے ساتھ دائمی نکاح کر سکتا ہے حالانکہ اس کا ارادہ یہ ہے کہ کچھ مدت کے بعد اسے طلاق دے دے گا اور اس کے ساتھ یہ شرط کرتا ہے کہ وہ نفقہ کا حق نہیں رکھے گی اور نہ ہی رات ساتھ سونے اور وراثت کا حق رکھے گی یعنی بالکل متعہ کے مشابہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس نکاح مسیار میں طلاق کے ذریعہ دونوں جدا ہوتے ہیں جبکہ متعہ میں باقی ماندہ مدت کو بخشنے کے ذریعے یا

نکاح کی مدت ختم ہو جانے کے ذریعہ مرد و عورت ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے ابتداء سے ہی عقد میں ایک محدود مدت معین کی تھی۔

اور اس سے بڑھ کر بھی دلچسپ یہ ہے کہ ماضی قریب میں ہی بعض اہلسنت جوانوں نے کہ جنہیں شادی کی مشکل تھی اور وہ مسائل سے دوچار تھے، انٹرنیٹ کے ذریعے ہمارے ساتھ رابطہ کیا ہے اور سوال کیا کہ کیا ہم متعہ کے مسئلہ میں شیعہ مجتہد کے فتویٰ پر عمل کر سکتے ہیں؟ ہم نے جواب دیا جی ہاں آپ اس مسئلہ میں شیعہ مسلک کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔

جو لوگ متعہ کا انکار کرتے ہیں اور نکاح "مسیار" کو اختیار کرتے ہیں در حقیقت وہ متعہ پر عمل کر رہے ہیں صرف اس کا نام نہیں لینا چاہتے ہیں!

ہاں "ضروریات" انسان کو "حقائق" کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں اگرچہ اس کا اظہار زبان پر نہ لائیں۔

پس یوں نتیجہ لیتے ہیں کہ جو لوگ متعہ کی مخالفت پر اصرار کرتے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر برائیوں اور بدکاریوں کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں مگر یہ کہ متعہ کے مشابہ "نکاح مسیار" کا فتویٰ دیں۔ اسی لیے آئمہ اطہار کی روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے "کہ بعض لوگ اسلامی طریقہ کے مطابق نکاح موقت" کی مخالفت نہ کرتے تو کوئی بھی زنا سے آلودہ نہ ہوتا"( )

( ) امام صادق فرماتے ہیں "لولا ما سبق من نہی عمر ما زنی الا شقی" (وسائل الشیعہ جلد ۱۴ ص [illegible]) اہلسنت کی کتاب میں بھی یہ حدیث کثرت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ قال علی "لولا ان عمر نہی عن المتعۃ ما زنی الا شقی" (تفسیر طبری، جلد ۵ ص ۹، تفسیر در المنثور جلد ۲ ص ۱۴۰، تفسیر قرطبی جلد ۵ ص [illegible])

اسی طرح جو لوگ اس متعہ سے سوء استفادہ کرتے ہیں (حالانکہ یہ محروم لوگوں کی ضروریات اور مسائل کے حل کے لیے شریعت کی طرف سے تجویز ہوا ہے) اور لوگوں کی نظروں میں اس کا چہرہ مسخ کرتے ہیں اور اسے اپنی ہوس رانی کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ بھی اسلامی معاشروں میں برائی اور زنا کی راہ ہموار کرنے میں مدد کر رہے ہیں اور گناہ میں آلودہ لوگوں کے ساتھ شریک ہیں کیونکہ یہ لوگ عملاً متعہ کے صحیح استعمال کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

بہر حال اسلام کہ جو الٰہی قانون ہے اور انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے اور انسان کی تمام ضروریات کو احاطہ کیے ہوئے ہے لیکن نہیں ہے کہ متعہ کا مسئلہ اسلام کے احکام میں بیان نہ ہوا ہو جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائیگا۔ نکاح موقت پر قرآن مجید بھی شاہد ہے اور احادیث نبوی میں بھی یہ مسئلہ بیان ہوا ہے اور اصحاب کی ایک جماعت کا عمل بھی اس پر رہا ہے۔ ہاں بعض لوگ اس اسلامی حکم کے منسوخ ہو جانے کے قائل ہیں اور جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ نسخ کے قائلین کے پاس کوئی معقول اور قانع کنندہ دلیل موجود نہیں ہے۔

متعہ کیا ہے؟

بعض ناآگاہ لوگ "نکاح موقت" کو انتہائی مسخ چہرے کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اسے "ممنوعہ اور جنسی آزادی کو قانونی شکل دینے" کے مترادف شمار کرتے ہیں!!

اگر اس قسم کے لوگ سب کے سب عوام الناس میں سے ہوتے تو کوئی مشکل نہیں تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ اہلسنت کے بعض علماء بھی اس قسم کی نازیبا نسبتیں دیتے ہیں۔ یقیناً شدید مذہبی تعصب انہیں اپنے مد مقابل کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے اور شاید

بعض علماء نے تو اس مسئلہ میں شیعوں کی کتب کی ایک سطر کا بھی مطالعہ نہ کیا ہو اور اسی بات پر ہمیں افسوس ہے۔

اس لیے ہم اس مختصری کتاب میں نکاح موقت کی شرائط اور اس کا نکاح دائم کے ساتھ فرق واضح الفاظ میں بیان کریں گے تاکہ سب پر حجت تمام ہو جائے۔

نکاح موقت اکثر شرائط و احکام میں نکاح دائم ہی کی طرح ہے۔

۱۔ مرد و عورت دونوں مکمل رضایت و اختیار کے ساتھ بغیر کسی جبر کے ایک دوسرے کو میاں بیوی بننے اور شادی کے لیے قبول کریں۔

۲۔ عقد کا صیغہ لفظ "نکاح" "ازدواج" یا "متعہ" کے ذریعے جاری کیا جائے اس کے علاوہ دوسرے الفاظ کافی نہیں ہیں۔

۳۔ اگر لڑکی باکرہ ہو تو ولی کی اجازت ضروری ہے اگر باکرہ نہ ہو تو اجازت شرط نہیں ہے۔

۴۔ عقد کی مدت اور حق مہر دقیق اور واضح طور پر معین کیا جائے۔ اگر مدت کو نکاح کے درمیان بیان کرنا بھول جائے تو بہت سے فقہاء کے فتویٰ کے مطابق یہ عقد، نکاح دائم میں تبدیل ہو جائیگا (اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہر دو نکاح کی حقیقت ایک ہی ہے صرف مدت کے ذکر کرنے یا نہ کرنے کے اعتبار سے فرق ہے) (توجہ فرمایئے)

۵۔ مدت کا اختتام، طلاق کی مثل ہے بلا فاصلہ عورت کو عدت گزارنا ہوگی (اگر آمیزش واقع ہوئی ہے)

۶۔ عقد دائم کی عدت تین مرتبہ ماہواری کا دیکھنا ہے یعنی تیسری مرتبہ ماہواری دیکھنے کے بعد عدت تمام ہو جائیگی۔ لیکن عقد موقت کی عدت دو مرتبہ ماہواری کا دیکھنا ہے۔

۷۔ عقد متعہ سے پیدا ہونے والے بچے شرعی حوالے سے اولاد شمار ہوتے ہیں۔ ان کے لیے تمام وہی احکام ہیں جو عقد دائم سے پیدا ہونے والے بچوں کے احکام ہیں۔ اور اسی طرح یہ بچے ماں، باپ، بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں سے وراثت بھی پائیں گے۔ ان بچوں اور دائمی شادی سے پیدا ہونے والے بچوں کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۸۔ یہ بچے بھی ماں، باپ کی کفالت میں رہیں گے ان کے تمام اخراجات و نفقہ نکاح دائمی سے ہونے والے بچوں کی طرح لازمی ہے کہ ادا کیے جائیں۔

بعض لوگ یہ شرائط سن کر شاید حیران ہوں۔ الکا حق بنتا ہے کیونکہ متعہ کے بارے غلط اور ظالمانہ ذہنیت پھیلائی گئی ہے۔ شاید لوگ اسے مخفی، ناجائز اور غیر قانونی شادی تصور کرتے ہیں یعنی ایک لفظ میں کہا جائے تو اسے زنا کے مشابہ خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔

ہاں ان دو نکاحوں کے درمیان میاں بیوی کے حقوق کے لحاظ سے کچھ فرق ہے۔ اس نکاح میں عقد دائمی کی نسبت" جس کے تعہد اور ذمہ داریاں بہت کم ہیں۔ کیونکہ اس نکاح کا مقصد ہی سہولت اور آسانی کا بہت سخت نہ ہونا ہے۔ من جملہ

۱۔ بیوی عقد متعہ میں نفقہ اور وراثت کی حقدار نہیں ہوتی۔ البتہ بعض فقہاء قائل ہیں کہ یہ اس صورت میں ہے جب نکاح میں نفقہ اور وراثت کی شرط نہ لگائی جائے یعنی اگر نکاح میں یہ شرط رکھی ہے تو پھر اس شرط کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔

۲۔ اس نکاح میں عورت آزاد ہے کہ گھر سے باہر جا کر کام (ملازمت) کر سکتی ہے۔ اس کے لیے شوہر کی اجازت شرط نہیں ہے جب تک یہ کام شوہر کے حقوق کو تلف نہ کرتا ہو۔ لیکن عقد دائم میں بیوی کیلئے شوہر کی رضایت کے بغیر باہر ملازمت کرنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ اس نکاح میں مرد پر واجب نہیں ہے کہ رات کو اپنی بیوی کے پاس رہے۔

مذکورہ احکام میں غور و فکر کرنے سے بہت سے سوالات، غیر منصفانہ قضاوت، شبہات اور تہمتوں کا جواب روشن ہو جائیگا اور اسلام کے اس حکیمانہ اور مقدس حکم کے بارے میں جاہل لوگوں کی غلط ذہنیت خود بخود ختم ہو جائیگی۔ اور اس گفتگو سے یہ بات بھی بالکل واضح و روشن ہو جاتی ہے کہ اس نکاح موقت کا زنا اور دیگر عفت کے منافی اعمال کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جو لوگ ان دونوں کا آپس میں قیاس کرتے ہیں وہ یقیناً نا آگاہ ہیں اور انہیں نکاح متعہ کی حقیقت اور شرائط کے بارے میں بالکل معلومات نہیں ہیں۔

سوء استفادہ: ہمیشہ مثبت امور سے سوء استفادہ بد زبان لوگوں کی زبان کھولتا اور بیہودہ گروں کو بہانہ فراہم کرتا ہے تا کہ اسے بہانہ بنا کر مثبت امور کے خلاف کام کریں اور ان پر زہر اگلیں۔

نکاح متعہ بھی اس قسم کی بحثوں کا ایک روشن مصداق ہے۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض ہوس پرستوں نے اس نکاح متعہ کو جو کہ حقیقت میں ضروریات کی گرہ کھولنے اور اجتماعی مشکلات کو حل کرنے کے لیے تشریع کیا گیا تھا، بازیچہ بنا دیا ہے اور بے اطلاع لوگوں کے سامنے اس کا چہرہ مسخ کر کے مخالفین کو بہانہ فراہم کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ حکیمانہ حکم تنقید کا نشانہ بن گیا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسا حکم ہے جس سے ایک دن ضرور سوء استفادہ نہ کیا گیا ہو اور وہ کونسا نفیس سرمایہ ہے جس سے نا اہل غلط طور پر بہرہ مند نہ ہوئے ہوں؟!

اگر لوگوں نے ایک دن جھوٹ اور دھوکے سے قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کیا تا کہ اپنی ظالم حکومت کا دفاع کر سکیں تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم قرآن مجید کو چھوڑ دیں؟!

یا اگر ایک دن منافقین نے مسجد ضرار بنا ڈالی جس کے ویران کرنے اور جلانے کا حکم خود پیغمبر اسلامؐ نے صادر فرمایا تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مسجد سے کنارہ کشی اختیار کریں؟

بہر حال ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ بعض نادان لوگوں نے اسلامی حکم سے سوء استفادہ کیا ہے لیکن چند بے نمازیوں کی وجہ سے مسجد کو تالا نہیں لگایا جا سکتا ہے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہوس پرستوں کے لیے راستہ بند کیا جائے اور اس نکاح متعہ کے صحیح راہ حل نکالا جائے۔

بالخصوص ہمارے زمانے میں یہ کام منظم اور دقیق راہ حل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ بعض شناسنت اور ماہر شخصیات اور اہل خبرہ لوگ اس مسئلے کے لیے ایک کارآمد اور قابل اجراء قانون نامہ لکھ کر شیاطین کے ہاتھ قطع کر دیں اور اس حکیمانہ حکم کے خوبصورت چہرہ کو آشکار کر دیں۔ تا کہ دو گروہوں کے لیے راستہ بند ہو جائے۔ ایک ہوس پرست گروہ اور دوسرا تنقید کرنے والا کینہ توز ٹولہ۔

نکاح متعہ قرآن و سنت اور اجماع کی روشنی میں:

قرآن مجید میں نکاح موقت کو "متعہ" کے عنوان کے ساتھ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۲۴ میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "فما استمتعتم به منهن فآتوهن اجورهن فريضة" پس جن عورتوں کے ساتھ تم متعہ کرو ان کا حق مہر انہیں ادا کرو"

اور اہم نکتہ یہ ہے کہ رسولخداؐ سے نقل شدہ بہت سی احادیث میں "متعہ" کا لفظ، نکاح موقت کے لیے استعمال کیا گیا ہے (جیسا کہ آئندہ ابحاث میں یہ روایات قارئین کی نظروں سے گزریں گی) اس کے علاوہ فقہاء اسلام کی کتابوں میں چاہے وہ شیعہ ہوں یا سنی ہر جگہ نکاح

موقت کو "متعہ" کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ پس اس بات کا انکار مسلمات کا انکار شمار ہوگا (فقہاء کے بعض کلمات بھی آئندہ اوراق میں آپکی خدمت میں پیش کیے جائینگے)

اس کے باوجود بعض لوگوں کا اصرار ہے کہ اس آیت میں "استمتاع" کا لفظ "لذت اٹھانے" اور "ہمبستری کرنے" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور کہتے ہیں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس وقت تم بیویوں سے جنسی استفادہ کرو تو انکا حق مہر ادا کیا کرو۔ اس بات میں واضح اعتراض ہیں۔

اولاً حق مہر کی ادائگی کا وجوب، عقد اور نکاح پر موقوف ہے۔ یعنی نکاح ہونے کے بعد عورت اپنے پورے حق مہر کی ادائگی کا مطالبہ کر سکتی ہے چاہے ہمبستری نہ ہوئی ہو حتی خوش لعبی بھی واقع نہ ہوئی ہو (ہاں، اگر ہمبستری سے پہلے طلاق واقع ہو جائے تو طلاق کے بعد حق مہر آدھا ہو جاتا ہے) (غور فرمایئے)۔

ثانیاً جیسا کہ کہا ہے کہ متعہ کی اصطلاح شریعت کی عرف میں، شیعہ اور سنی فقہاء کے کلمات اور احادیث کی زبان میں "نکاح موقت" کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ اس بات کی دلائل مفصل طور پر آپ کے سامنے پیش کی جائیں گی۔

مشہور مفسر مرحوم طبرسی، تفسیر مجمع البیان میں اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں وضاحت فرماتے ہیں کہ اس آیت کے بارے میں دو نظریے ہیں، ۱۔ ایک ان لوگوں کا نظریہ ہے جو استمتاع کو "لذت اٹھانے" کے معنی میں تفسیر کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے بعض اصحاب یا تابعین وغیرہ کو اس نظریہ کے قائلین کے طور پر پیش کیا ہے ۲۔ دوسرا ان لوگوں کا نظریہ ہے جو قائل ہیں کہ یہ آیت عقد متعہ اور نکاح موقت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اسے انہوں نے ابن عباس و سدی و ابن مسعود اور تابعین کے ایک گروہ کا نظریہ قرار دیا ہے۔

اس کے بعد وہ تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دوسرا نظریہ واضح ہے کیونکہ متعہ اور تمتع کا لفظ شریعت کی عرف میں نکاح موقت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے علاوہ دوسری دلیل یہ ہے کہ حق مہر کا وجوب لذت اٹھانے کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔(۱)

قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جمہور کے عقیدہ کے مطابق اس آیت سے مراد وہی نکاح موقت ہے جو صدر اسلام میں رائج تھا۔(۲)

اس کے علاوہ سیوطی نے تفسیر در المنثور میں، اور ابو حیان، ابن کثیر اور ثعالبی نے اپنی تفاسیر میں اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ مسئلہ تمام علمائے اسلام (شیعہ و سنی) کے نزدیک مسلم ہے کہ نکاح موقت (متعہ) پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں موجود تھا۔ لیکن فقہائے اہلسنت کی ایک بڑی جماعت قائل ہے کہ یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا تھا۔ البتہ کس زمانے میں منسوخ ہوا؟ اس بارے میں انکا شدید اختلاف ہے۔ اور یہ بات توجہ طلب ہے۔

من جملہ مشہور عالم "جناب نووی" صحیح مسلم کی شرح میں یوں اقوال نقل کرتے ہیں۔

۱۔ بعض کہتے ہیں کہ (متعہ کو) غزوہ خیبر میں پہلے حلال کیا گیا پھر حرام کر دیا گیا۔

۲۔ صرف عمرۃ القضاء میں حلال تھا۔

۳۔ فتح مکہ کے دن پہلے حلال اور پھر حرام کر دیا گیا۔

۴۔ غزوہ تبوک (۹ ہجری ق) میں حرام کیا گیا۔

۵۔ صرف جنگ اوطاس (سنہ ۸ ہجری ق) میں حلال کیا گیا۔

۱۔ تفسیر مجمع البیان، جلد ۳، ص ۳۲۔

۲۔ تفسیر قرطبی، جلد ۵، ص ۱۳۰، و فتح القدیر، جلد ۱، ص ۴۴۹۔

۶۔ حجۃ الوداع (سنہ ۱۰ ہجری ق) میں حلال کیا گیا۔(۱)

دلچسپ یہ ہے کہ اس بارے میں متضاد روایات نقل کی گئی ہیں بالخصوص جنگ خیبر میں اس کی تحریم اور حجۃ الوداع میں اس کی تحریم والی روایت مشہور ہیں۔ بعض اہلسنت فقہاء نے ان دو احادیث کو جمع کرنے کے لیے بہت کوشش کی ہے لیکن کوئی مناسب راہ حل پیش نہیں کر سکے ہیں۔(۲)

اور اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جناب شافعی کا یہ جملہ ہے، وہ فرماتے ہیں: "لا اعلم شيئاً احل الله ثم حرمه ثم احله، ثم حرمه الا المتعة" مجھے متعہ کے علاوہ کسی اور چیز کا علم نہیں ہے کہ اسے پہلے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہو پھر حرام کر دیا ہو پھر دوبارہ حلال کیا ہو اور اس کے بعد پھر حرام کر دیا ہو۔"(۳)

دوسری طرف سے ابن حجر، سہیلی سے نقل کرتے ہیں کہ غزوۂ خیبر کے دن متعہ کی تحریم ایسی چیز ہے جسے راویوں اور ارباب تاریخ میں سے کسی نے نقل نہیں کیا۔(۴)

۷۔ ایک اور قول یہ ہے کہ متعہ رسولخدا کے زمانے میں حلال تھا بعد میں حضرت عمر نے اس سے منع کیا ہے۔ جیسا کہ اہلسنت کی معتبر ترین کتاب صحیح مسلم میں یوں آیا ہے: "ابن ابی نضرۃ" کہتے ہیں میں جناب جابر ابن عبداللہ انصاری کی خدمت میں تھا وہ کہنے لگے کہ ابن زبیر اور ابن عباس کے درمیان عورتوں کے ساتھ متعہ اور متعۂ حج (حج تمتع یعنی عمرہ اور حج کے

۱) شرح صحیح مسلم جلد ۹ ص ۱۹۱۔
۲) ایضاً۔
۳) المغنی ابن قدامہ جلد ۷ ص ۵۷۲۔
۴) فتح الباری جلد ۹ ص ۱۳۸۔

درمیان فاصلہ ہو) کے مسئلہ میں اختلاف تھا (میں نے کہا آپ کی کیا نظر ہے؟) کہنے لگے ہم نے ہر دو مسئلوں پر رسولخدا کے زمانے میں عمل کیا ہے یہاں تک کہ حضرت عمر نے ہر دو سے منع کر دیا اس کے بعد ہم نے پرہیز کیا۔"(۱)

اس صریح نص کے بعد اور وہ بھی صحیح مسلم جیسی کتاب میں، کیا اب بھی کہا جا سکتا ہے کہ متعہ رسولخدا کے دور میں حرام ہو گیا تھا۔

کس نے متعہ کو حرام کیا؟

جس بات کو ہم نے اوپر جناب جابر ابن عبداللہ انصاری سے نقل کیا ہے وہ اس مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے جسے اہلسنت کے بہت سے محدثین، مفسرین اور فقہاء نے اپنی کتابوں میں خلیفۂ دوم سے نقل کیا ہے۔ حدیث کا متن یوں ہے:

"متعتان كانتا مشروعتين في عهد رسول الله وانا انهى عنهما متعة الحج ومتعة النساء"

دو متعے تھے جو رسولخدا کے زمانے میں جائز اور حلال تھے میں ان دونوں سے منع کرتا ہوں ایک حج متعہ اور دوسرا متعہ النساء (نکاح موقت)

بعض کتابوں میں یہ حدیث اس جملہ کے اضافہ کے ساتھ نقل ہوئی ہے "واعاقب عليهما" اور میں ان دونوں پر سزا دوں گا۔

متعۂ حج سے یہ مراد ہے کہ حاجی پہلے عمرہ بجا لائے اور احرام کھول دے اس کے بعد حج کے دنوں میں دوبارہ حج کا احرام باندھے۔

۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۹۵ حدیث ۱۲۴۹ دار الفکر بیروت۔

یہ حدیث اُن مشہور احادیث میں سے ہے جو تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ حضرت عمر سے نقل ہوئی ہے کہ انہوں نے منبر سے یہ بات لوگوں کے سامنے بیان کی۔ ہم ذیل میں اہلسنت کی حدیث، فقہ اور تفسیر کی کتب میں سے اس حدیث کے سات حوالے ذکر کرتے ہیں۔

١۔ مسند احمد، جلد ٣ صفحہ ٣٢٥۔

٢۔ سنن بیہقی، جلد ٧ صفحہ ٢٠٦۔

٣۔ المبسوط سرخسی، جلد ٣ صفحہ ٢٧۔

٤۔ المغنی ابن قدامہ، جلد ٧ صفحہ ٥٧١۔

٥۔ محلی ابن حزم، جلد ٧ صفحہ ١٠٧۔

٦۔ کنزالعمال، جلد ١٦ صفحہ ٥٢٠۔

٧۔ تفسیر کبیر فخر رازی جلد ١٠ صفحہ ٥٢۔

یہ حدیث چند مسائل سے پردہ اٹھاتی ہے۔

الف) خلیفۂ اول کے دور میں متعہ کا حلال ہونا:

متعہ (نکاح موقت) رسول کرمؐ کی طول حیات میں بلکہ خلیفۂ اول کے دور حکومت میں بھی حلال تھا اور خلیفہ دوم نے بعد میں اس سے منع کیا!۔

ب) اجتہاد در مقابل نص:

خلیفہ اپنی تئی اتھارٹی سمجھتے تھے کہ پیغمبر اکرمؐ کی صریح نص کے مقابلے میں نیا قانون اور اسلامی حکم جعل کریں حالانکہ قرآن مجید واضح طور پر ارشاد فرماتا ہے کہ:

"و ما آتاکم الرسول فخذوہ و ما نہاکم عنہ فانتھوا"(١)

"پیغمبر جو کچھ آپ کو دیں اسے لے لیں اور جس چیز سے منع کریں اس سے پرہیز کریں"

کیا پیغمبر اکرمؐ کے علاوہ کسی اور کو احکام الٰہی میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے؟

کیا کوئی بھی شخص یوں کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ایسا کیا لیکن میں یوں کرتا ہوں؟

کیا پیغمبر اکرمؐ کی صریح نص کے مقابلے میں کہ جو وحی سے اخذ شدہ ہے اجتہاد کرنا جائز ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ رسولخداؐ کے احکام کو اتنی لاپرواہی کے ساتھ رد کرنا واقعاً تعجب آور ہے اور اس سے بڑھ کر اگر نص کے مقابل میں اجتہاد کا دروازہ کھول دیا جائے تو کیا ضمانت ہے کہ دوسرے لوگ ایسا کام نہیں کریں گے؟ کیا اجتہاد صرف ایک آدمی کے ساتھ مخصوص تھا اور دوسرے لوگ مجتہد نہیں ہو سکتے ہیں؟

یہ بات حساس مسئلہ ہے کیونکہ نص کے مقابلے میں اجتہاد کا دروازہ کھل جانے کے بعد احکام الٰہی میں سے کچھ بھی محفوظ نہیں رہے گا، اور اسلام کے جاودانہ احکام میں عجیب ہرج مرج پیدا ہو جائیگا اور اس طرح تمام اسلامی احکام خطرے میں پڑ جائیں گے۔

حضرت عمر کی مخالفت کا سبب:

کیوں حضرت عمر ان دو احکام الٰہی کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے؟ حج تمتع کے

(١) سورۂ حشر، آیہ ٧۔

بارے میں ان کا خیال یہ تھا جو مسلمان حج کے لیے آتے ہیں انہیں حج اور عمرہ ختم کرنے کے بعد احرام کھولنے چاہئیں اور بعد میں مثلاً اپنی بیویوں کے ساتھ آمیزش کرنی چاہیے اور یہ کہ عمرہ تمتع انجام دینے کے بعد حاجی چند دن کے لیے احرام کھول دے اور آزاد ہو جائے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے اور روح حج کے ساتھ سازگار نہیں ہے!

یہ خیال درست نہیں ہے، کیونکہ حج اور عمرہ دو علیحدہ عمل ہیں اور ممکن ہے ان دو اعمال کے درمیان ایک ماہ سے زیادہ فاصلہ ہو۔ مسلمان ماہ شوال یا ذی قعدہ میں مکہ مشرف ہوتے ہیں اور عمرہ بجا لاتے ہیں اس کے بعد آٹھ ذی الحجہ تک آزاد ہوتے ہیں پھر حج کے موسم میں دوبارہ احرام باندھتے ہیں اور عرفات چلے جاتے ہیں اس بات پر کیا اشکال ہے جس کی وجہ سے حضرت عمر نے اپنے سخت رد عمل کا مظاہرہ فرمایا اور بہرحال متعہ اور نکاح موقت کے بارے میں (بعض لوگوں کے عقیدہ کے مطابق) ان کا خیال یہ تھا کہ اگر متعہ جائز ہو تو پھر نکاح اور زنا کے درمیان شناخت مشکل ہو جائے گی۔ کیونکہ اس صورت میں، اگر کسی مرد اور عورت کو پکڑا جائے تو وہ کہہ دیں گے کہ ہم نے آپس میں متعہ کیا ہوا ہے! اس طرح زنا کی شرح بڑھ جائیگی!

یہ خیال تو اس پہلے خیال سے زیادہ بودا ہے، چونکہ اتفاقاً مسئلہ الٹ ہے کیونکہ متعہ سے منع کرنا زنا اور بے عفتی کے بڑھاؤ کا موجب ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے کہ بہت سے ایسے جوان جو دائمی ازدواج کی قدرت نہیں رکھتے ہیں یا ایسے لوگ جو اپنی بیوی سے دور ہیں اور زنا یا نکاح موقت کے علاوہ ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے واضح سی بات ہے کہ انہیں منع کرتے اور عقد موقت سے روک کر گناہوں اور بے عفتی کی وادی میں دھکیلنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی مشہور حدیث میں یوں نقل ہوا ہے کہ اگر

جناب عمر متعہ سے منع نہ کرتے تو سوائے شقی اور بدبخت کے کوئی بھی انسان دنیا میں زنا سے آلودہ نہ ہوتا "لو لا ان عمر نهی الناس عن المتعة ما زنی الا شقی"(۱)

متعہ کی تحریم کے بعد لوگوں کا رد عمل:

مذکورہ بالا روایت سے کہ جسے اہلسنت کے بہت سے محدثین، مفسرین اور فقہاء نے نقل کیا ہے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ متعہ کی تحریم حضرت عمر کے زمانے میں تھی نہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں اس کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات جو انہی کتب میں نقل ہوئی ہیں اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند ایک روایات ذکر کرتے ہیں

۱۔ مشہور محدث جناب ترمذی نقل کرتے ہیں کہ اہل شام کے ایک آدمی نے جناب عبداللہ بن عمر سے متعہ نساء کے بارے میں سوال کیا، انہوں نے کہا۔ حلال ہے۔ سائل نے کہا آپ کے والد حضرت عمر نے اس سے منع کیا ہے۔ جناب عبداللہ بن عمر نے کہا

"ارأیت ان کان ابی قد نهی عنها و قد سنّها رسول الله، انترک السنة و نتبع قول ابی؟"(۲)

۱) تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۰، ص ۵۰۔

۲) یہ حدیث آج کل کی شائع شدہ صحیح ترمذی میں اس طرح نہیں ہے بلکہ اس میں متعہ النساء کی جگہ متعہ الحج آیا ہے۔ لیکن جناب زین الدین المعروف شہید ثانی نے کہ جو دسویں صدی کے علماء میں سے تھے کتاب شرح لمعہ میں اور مشہور علامہ ابن طاؤس نے کہ جو ساتویں صدی کے علماء میں سے تھے کتاب الطرائف میں اسی حدیث کو متعہ النساء کے ساتھ نقل کیا ہے جیسا کہ پتہ چلتا ہے کہ صحیح ترمذی کے قدیمی نسخوں میں یہ حدیث اسی طرح تھی لیکن بعد میں اس میں تبدیلی کر دی گئی ہے (اور اس قسم کی مثالیں بہت زیادہ ہیں)

اگر ہم سے عبداللہ ایک چیز سے منع کریں جس کو رسولِ خدا نے اسے سنت قرار دیا ہو تو کیا ہم
آنحضرت کی سنت کو ترک کر کے آپ کے باپ کی بات پر عمل کریں گے؟!

ایک اور حدیث (صحیح مسلم) میں جناب جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم رسولِ خداؐ کے زمانے میں تھوڑی سی کھجوروں یا ستّو کے حق مہر پر چند دن کے لیے متعہ کر لیا کرتے تھے اور یہ سنت حضرت ابوبکر کے زمانے میں بھی جاری تھی یہاں تک کہ حضرت عمر نے "عمرو بن حریث" والے واقعہ کی وجہ سے اس کام سے منع کر دیا۔(۱)

۲۔ اسی کتاب میں ایک اور حدیث میں یوں آیا ہے کہ ابن عباس اور ابن زبیر کا متعۃ النساء اور متعۃ الحج کے بارے میں اختلاف ہو گیا (اور انہوں نے جناب جابر ابن عبداللہ انصاری کو ثالث بنایا) تو جابر نے کہا ہم نے ان دونوں پر رسولِ خداؐ کے زمانے میں عمل کیا ہے اس کے بعد حضرت عمر نے منع کیا اور ہم نے پرہیز کیا!(۲)

۳۔ ابن عباس کہ جنہیں "حبر الامۃ" (امت کے عالم) کا لقب دیا گیا ہے، رسولِ خداؐ کے زمانے میں حکم متعہ کے منسوخ نہ ہونے کے قائل تھے اس بات کی دلیل ان کے اور جناب عبداللہ بن زبیر کے درمیان ہونے والی بحث ہے جسے صحیح مسلم میں نقل کیا گیا ہے عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں رہائش رکھی ہوئی تھی ایک دن (کچھ لوگوں کے سامنے جن میں جناب ابن عباس بھی تھے) کہنے لگے بعض ایسے لوگ کہ خداوند نے ان کے دل کی آنکھوں کو اپنی ظاہری آنکھوں کی طرح اندھا کر دیا ہے، وہ فتویٰ دیتے ہیں کہ متعہ جائز ہے۔ ان کا مقصد ابن عباس کو سنانا تھا جو کہ اس زمانے میں نابینا ہو چکے تھے۔ ابن عباس نے جب یہ بات سُنی تو کہنے لگے

۱) صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۳۱۔
۲) صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۳۱۔

کہ تو ایک بے وقوف اور نادان آدمی ہے، مجھے اپنی جان کی قسم ہم نے رسولِ خداؐ کے زمانے میں اس سنت پر عمل کیا ہے۔ ابن زبیر نے (رسولِ خداؐ کے نام سے بے پرواہی کرتے ہوئے) کہا: تو ذرا کر دیکھ لے خدا کی قسم اگر تو نے اس پر عمل کیا تو تجھے سنگسار کر دوں گا۔(۱)

یعنی منطقی بات کا جواب زور اور دھمکی کے ساتھ دیا!

اتفاقاً یہ بات اس زمانے کی ہے جب عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں حکومت حاصل کر لی تھی اسی لیے تو اس نے ابن عباس جیسے دانشمند اور عالم کے مقابلے میں ایسی بات کرنے کی جرأت کی۔ حالانکہ ابن عباس، سن کے اعتبار سے اس کے باپ کے برابر تھے اور علم کے اعتبار سے تو یا اُسکے ساتھ قابل قیاس ہی نہیں تھا۔ بالفرض، اگر علم میں اُسکے برابر بھی ہوتا تو اس قسم کی دھمکی کا حق اُسے نہیں پہنچتا تھا۔ کیونکہ اس قسم کے احکام میں، اگر کوئی اپنے فتویٰ پر عمل کرے اور بالفرض اس کا فتویٰ غلط بھی ہو تب بھی "وطی بالشبہہ" شمار ہوگی اور معلوم ہے کہ وطی بالشبہہ میں حد جاری نہیں ہوتی ہے لہذا سنگسار کرنے کی دھمکی دینا ایک بے عقلی اور جاہلانہ بات ہے۔

البتہ اس قسم کی بے ہودہ دھمکی عبداللہ بن زبیر جیسے ایک نادان اور گستاخ جوان کی طرف سے بعید نہیں ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ راغب نے کتاب محاضرات میں نقل کیا ہے کہ عبداللہ ابن زبیر نے سرزنش کے لہجے میں ابن عباس کو کہا کہ تم کیوں "متعہ" کو حلال سمجھتا ہے۔ ابن عباس نے کہا جا کر اپنی ماں سے پوچھ لے اور اپنی ماں کے پاس آیا۔ ماں نے اس سے کہا "ما ولدتک الا فی المتعہ" تو اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب میں تیرے باپ کے متعہ میں

۱) سنن بیہقی، جلد ۷، ص ... ، حدیث ۲۳۴ ۔ چاپ دار الفکر ۔

تھی''(۱)

۵۔ مسند احمد میں ''عمران بن حصین'' سے نقل کیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں متعہ کی آیت نازل ہوئی اور اس پر ہم نے عمل کیا اور اس کو منسوخ کرنے والی آیت نازل نہیں ہوئی یہاں تک کہ رسولخدا کی رحلت ہوگئی۔(۲)

یہ ان روایات کے بعض نمونے ہیں جو صراحت کے ساتھ حکم متعہ کے منسوخ نہ ہونے کو بیان کرتے ہیں۔

ان روایات کے مقابلے میں کچھ روایات نقل کی گئی ہیں جو کہتی ہیں کہ یہ حکم رسولخدا کے زمانے میں منسوخ ہو چکا تھا۔ اے کاش یہ روایات آپس میں متفق ہوتیں اور ایک ہی زمانے کی نشاندہی کرتیں لیکن افسوس یہ ہے کہ ہر روایت نے دوسری روایت سے جداگانہ زمانے کو بیان کیا ہے۔

۱۔ ان روایات میں سے بعض میں ذکر ہوا ہے کہ متعہ کی تحریم کا حکم جنگ خیبر والے دن (۷ ہجری میں) صادر ہوا۔(۳)

۲۔ بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ رسولخدا نے عام الفتح (فتح مکہ والے سال ۸ ہجری) میں مکہ کے اندر متعہ کی اجازت فرمائی اور کچھ عرصے کے بعد اسی سال منع فرمادیا۔(۴)

۳۔ بعض دیگر روایات میں آیا ہے کہ غزوہ اوطاس میں (فتح مکہ کے بعد) ہوازن کی

۱) محاضرات، جلد ۲، ص ۹۴؛ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد ۱۲، ص ۲۵۱۔
۲) مسند احمد، جلد ۴، ص ۴۳۶۔
۳) زاد المعاد، جلد ۲، ص ۱۸۴۔
۴) صحیح مسلم، جلد ۴، ص ۱۳۳۔

سرزمین پر (مکہ کے نزدیک) تین دن کے لیے اجازت فرمائی اس کے بعد منع فرمادیا(۱)

اگر کوئی مختلف اقوال کی تحقیق انجام دے تو معلوم ہوگا کہ اس مسئلہ میں اختلاف اس سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ اہلسنت کے مشہور فقیہ (جناب نووی) نے صحیح مسلم کی شرح میں اس مسئلے کے بارے میں چھ قول نقل کیے ہیں اور ہر قول کسی نہ کسی روایت کے ساتھ سازگار ہے

۱۔ متعہ جنگ خیبر میں حلال کیا گیا اور پھر (اس کے چند دن بعد) حرام ہوگیا
۲۔ عمرۃ القضاء میں حلال ہوا (پھر حرام ہوگیا)
۳۔ فتح مکہ کے دن حلال ہوا اس کے بعد حرام ہوگیا
۴۔ رسولخدا نے غزوہ تبوک کے دن حرام کیا
۵۔ جنگ ہوازن میں (سرزمین اوطاس پر) حلال کیا گیا
۶۔ حجۃ الوداع میں پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے آخری سال میں اسے حلال قرار دیا گیا ہے(۲)

ان سب اقوال سے تعجب آور امام شافعی کا کلام ہے وہ کہتے ہیں ''مجھے متعہ کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں ملی جسے اللہ تعالیٰ نے پہلے حلال کیا ہو پھر حرام کردیا ہو اس کے بعد دوبارہ حلال کیا ہو اور پھر حرام کردیا ہو''(۳)

ہر شخص ان متضاد روایات کا مشاہدہ کرکے اس بات کا اطمینان حاصل کرلیتا ہے کہ یہ روایات جعلی اور ایک سیاسی منصوبہ بندی کے تحت جعل کی گئی ہیں۔

بہترین راہ حل

حقیقت یہ ہے کہ ان مختلف اور متضاد اقوال کو دیکھ کو ہر انسان اس مسئلہ میں تحقیق و جستجو کی

۱) مصدر سابق، ص ۳۳۔
۲) شرح صحیح مسلم نووی، جلد ۹، ص ۱۹۱۔
۳) المغنی ابن قدامہ، جلد ۷، ص ۵۷۲۔

طرف مائل ہوتا اور سوچتا ہے کہ ایسا کونسا واقعہ رونما ہوا ہے کہ مسئلہ میں اسقدر متضاد و متناقض روایات بیان کی گئی ہیں اور ہر محدث یا فقیہ نے کیوں اپنا جداگانہ راستہ اختیار کیا ہے؟

ان متضاد روایات کے درمیان کس طرح جمع کیا جا سکتا ہے؟

کیا یہ سب اختلاف اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس مقام پر کوئی نازک سیاسی مسئلہ درپیش تھا جس نے حدیث گھڑنے والوں کو اس بات پر ابھارا کہ روایات جعل کریں اور اصحاب رسولؐ کے نام سے سوء استفادہ کرتے ہوئے ان روایات کو انکی طرف نسبت دیں کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے اس طرح نقل کیا ہے۔ اور وہ سیاسی مسئلہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خلیفہ دوم نے کہا تھا "دو چیزیں رسول خداؐ کے زمانے میں حلال تھیں اور میں انہیں حرام کر رہا ہوں ان میں سے ایک "متعہ النساء ہے"۔ اس بات کا ایک عجیب منفی اثر تھا کیونکہ اگر منصب کے افراد یا خلفاء اسلام کے احکام کو اس صراحت کے ساتھ تبدیل کر دیں تو پھر یہ کام صرف خلیفہ ثانی کے ساتھ مخصوص نہ رہتا بلکہ دوسروں کو بھی یہ حق مل جاتا کہ رسول خداؐ کی نص کے مقابلے میں اجتہاد کریں۔ اور اس صورت میں احکام اسلام یعنی واجبات اور محرمات کے درمیان ہرج و مرج پیدا ہو جاتا اور زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کے دامن میں کچھ باقی نہ رہتا۔

اس منفی اثر کو ختم کرنے کے لیے ایک گروہ نے یہ کام شروع کیا کہ کہنے لگے: ان دو احکام کی حرمت خود رسول خداؐ کے زمانے میں واقع ہوئی تھی۔ ہر ایک نے نئی حدیث گھڑ لی اور اسے اصحاب رسولؐ کی طرف نسبت دے دی۔ کیونکہ کوئی بھی حدیث واقعیت نہیں رکھتی تھی اس لیے ایک دوسرے سے متضاد بن گئیں!!

ورنہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی احادیث ایک دوسرے کے مخالف ہوں حتی کہ بعض فقہاء کو ان کے درمیان جمع کرنے کے لیے کہنا پڑا کہ متعہ ایک زمانے میں مباح تھا پھر حرام ہو گیا پھر مباح

ہو گیا پھر حرام ہو گیا کیا احکام الٰہی کھیل ہیں کہ جو ہر روز تبدیل ہوتے رہیں۔

ان سب باتوں سے قطع نظر، رسول خداؐ کے زمانے میں متعہ کا مباح ہونا احتمالاً ایک ضرورت کی وجہ سے تو وہ ضرورت دوسرے زمانوں میں بھی موجود ہے۔ بالخصوص ہمارے زمانے میں مغربی ممالک کی طرف طولانی سفر کرنے والے بعض جوانوں کے لیے یہ ضرورت شدت کے ساتھ موجود ہے پس متعہ کیوں حرام ہو؟

اس زمانے میں سماجی معاشرے میں جذبات بھڑکانے کے عوامل اتنے زیادہ نہیں تھے۔ بے پردہ عورتیں، مجالس، ٹیلی ویژن، تزئینات، ڈش، فساد والی محفلیں اور فاسد لٹریچر وغیرہ جو سب کچھ آج کے زمانے میں بہت سے جوانوں کے دامن گیر ہوتے ہیں اس زمانے میں نہیں تھے۔ اس زمانے میں متعہ کو ایک احتیاج اور ضرورت کے عنوان سے جائز قرار دیا گیا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے اس سے منع کر دیا گیا ہے؟ کیا یہ بات قابل قبول ہے؟

ان سب امور سے چشم پوشی کرتے ہوئے فرض کر لیتے ہیں کہ بہت سے فقہائے اسلام اس کو حرام شمار کرتے ہیں اور فقہاء کا ایک گروہ اس کو جائز سمجھتا ہے۔ اور یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ پس اس صورت میں یہ سزاوار نہیں ہے کہ حلال کے طرفدار لوگ اسے حرام سمجھنے والوں پر احکام دین کی پابندی نہ کرنے کی تہمت لگائیں۔ اسی طرح اسکی حرمت کے قائل افراد کیلئے یہ سزاوار نہیں کہ اسے مباح سمجھنے والوں پر معاذ اللہ زنا کے طرفدار ہونے کی تہمت لگائیں۔ اگر ایسا کریں تو قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے حضور کیا جواب دیں گے؟ پس پتہ چلتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ ایک اجتہادی اختلاف ہے۔

جناب فخر رازی اس قسم کے مسائل میں ایک خاص تعصب رکھنے کے باوجود اپنی تفسیر میں

فرماتے ہیں کہ "ذھب السواد الاعظم من الأمة الی انھا صارت منسوخة و قال السواد منھم انھا بقیت کما کانت" امت کی اکثریت قائل ہے کہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن ایک گروہ قائل ہے کہ یہ حکم اسی طرح باقی ہے"(۱) یعنی یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔

ہم اس جگہ نکاح موقت کی بحث کو تمام کرتے ہیں۔ اور سب لوگوں سے امید کرتے ہیں کہ تہمتیں لگانے اور بغیر علم کے قضاوت کرنے کی بجائے ایک بار پھر اس مسئلہ پر تحقیق اور اس کے بعد قضاوت کریں۔ یقیناً انہیں اطمینان ہو جائیگا کہ خدا آج بھی ایک حکم الٰہی ہے اور شرائط کی پابندی کرتے ہوئے یہ آج بھی بہت سی مشکلات کو حل کرتا ہے۔

۱) تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۰ ص ۴۹۔

٦

زمین پر سجدہ

عبادات میں سجدہ کی اہمیت:

اسلام کی نظر میں سجدہ، اللہ تعالیٰ کی سب سے اہم یا اہم ترین عبادات میں سے ایک ہے۔ اور جیسا کہ احادیث میں بیان کیا گیا ہے، کہ انسان سجدہ کی حالت میں دیگر تمام حالات کی نسبت سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوتا ہے۔ تمام بزرگان دین بالخصوص رسول اکرمؐ اور اہلبیتؑ بہت طولانی سجدے کیا کرتے تھے۔ خدا کی بارگاہ میں طولانی سجدے انسان کی روح اور جان کی نشوونما کرتے ہیں۔ اور یہ اس لم یزل کی بارگاہ میں خضوع اور عبودیت کی سب سے بڑی علامت شمار ہوتے ہیں۔ اسی لیے نماز کی ہر رکعت میں دو سجدے بجالانے کا حکم دیا گیا ہے۔

اسی طرح سجدہ شکر اور قرآن مجید کی تلاوت کے دوران مستحب اور واجب سجدے بھی اسی سجدہ کا واضح ترین مصداق شمار ہوتے ہیں۔

انسان سجدہ کی حالت میں سوائے خدا کے ہر چیز کو بھول جاتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے بہت نزدیک پاتا ہے اور گویا وہ اپنے آپ کو بساط قرب پر پاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سیر وسلوک و عرفان کے اساتید اور اخلاق کے معلم حضرات، سجدہ کے مسئلہ پر انتہائی تاکید فرماتے ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب اس مشہور حدیث پر ایک روشن دلیل ہیں کہ انسان کا کوئی عمل بھی شیطان کو اتنا پریشان نہیں کرتا جتنا سجدہ اسے پریشان کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ" جناب ختمی مرتبت نے اپنے ایک صحابی کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اگر چاہتے ہو کہ قیامت کے دن میرے ساتھ محشور ہو تو خداوند قہار کے حضور طولانی سجدے انجام دیا کرو"

و اذا اردت ان یحشرک اللّٰہ معی یوم القیامۃ

فاطل السجود بین یدی اللّٰہ الواحد القھار"(۱)

غیر خدا کے لیے سجدہ کرنا جائز نہیں ہے:

ہمارا عقیدہ ہے کہ اس واحد و یکتا پروردگار کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ سجدہ انتہائی عاجزی اور خضوع کی علامت اور پرستش کا روشن مصداق ہے اور پرستش و عبادت صرف ذات خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت" وللّٰہ یسجد من فی السموات و الارض"(۲) میں کلمہ "اللّٰہ" کو مقدم کیا گیا ہے اور یہ تقدیم حصر پر دلالت کر رہی ہے یعنی زمین اور آسمان کی ہر چیز صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتی ہے!

اسی طرح سورۂ اعراف کی ۲۰۶ نمبر آیت " و لہ یسجدون" بھی اس بات پر بہترین دلیل ہے کہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔

۱) حلیۃ الابکار، مادہ سجدہ۔

۲) سورۂ رعد، آیہ ۱۵۔

حقیقت میں سجدہ خضوع کا آخری درجہ ہے اور یہ درجہ خداوند عالم کے ساتھ مخصوص ہے۔ پس کسی اور شخص یا چیز کے لیے سجدہ کرنا گویا خداوند عالم کے برابر قرار دینا ہے اور یہ درست نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک توحید کے معانی میں سے ایک معنی" توحید در عبادت" ہے یعنی پرستش اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے بغیر توحید کامل نہیں ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں غیر خدا کی عبادت کرنا شرک کی ایک قسم ہے اور سجدہ عبادت شمار ہوتا ہے اس لیے غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔

اور جو سجدہ ملائکہ نے حضرت آدم کو کیا تھا (اور اسکا قرآن مجید میں کئی مقامات پر تذکرہ ہے) مفسرین کے بقول یا تو یہ حضرت آدم کی تعظیم، تکریم اور احترام کا سجدہ تھا نہ عبادت کا سجدہ، بلکہ اس سجدے سے ملائکہ کی مراد یہ تھی کہ چونکہ یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے لہٰذا اس ذات حق کی معبودیت ہے۔ اور یا یہ شکر خدا کا سجدہ تھا۔ اسی طرح جو سجدہ حضرت یعقوب اور کے بیوی بچوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے کیا تھا اور اسے قرآن مجید نے" خروا لہ سجدا" اور سب انکے سامنے سجدہ میں گر پڑے" کے الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ شکر تھا۔ یا ایک قسم کی تعظیم، تکریم اور احترام کے معنی میں سجدہ تھا۔

اور قابل توجہ یہ ہے کہ" وسائل الشیعہ" کہ جو ہماری کتب حدیث کا ایک مصدر شمار ہوتی ہے، میں سجدہ نماز کے ابواب میں ایک مکمل باب"عدم جواز السجود لغیر اللّٰہ" کے عنوان سے ذکر ہوا ہے اور اس میں پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومینؑ سے سات احادیث نقل کی گئی ہیں کہ غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔(۱)

(۱) وسائل الشیعہ، جلد ۴، ص ۹۸۶

اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین فرما لیجئے کیونکہ آئندہ اسی گفتگو سے ہم نتیجہ اخذ کریں گے۔

کس چیز پر سجدہ کرنا چاہیے:

مکتب اہلبیت کے پیروکاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زمین کے علاوہ کسی چیز پر سجدہ نہیں ہو سکتا ہے، ہاں البتہ جو چیزیں زمین سے اگتی ہیں اور کھانے و پینے کے کام نہیں آتیں جیسے درختوں کے پتے اور لکڑی وغیرہ اسی طرح حصیر و بوریا وغیرہ۔ ان پر سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ علماء اہلسنت عام طور پر معتقد ہیں کہ ہر چیز پر سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ ہاں ان میں سے صرف بعض علماء نے لباس کی آستین اور عمامہ و پگڑی کے گوشے کو مستثنیٰ کیا ہے کہ ان پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں مکتب اہلبیت والوں کی دلیل، رسولخداؐ اور آئمہ اطہارؑ سے نقل ہونے والی احادیث اور اصحاب کا عمل ہے۔ اسی حکم اور سنت کی وجہ سے وہ اس عقیدہ پر اصرار کرتے ہیں اور اسی لیے مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ میں اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ قالین وغیرہ پر سجدہ نہ کریں بلکہ پتھر پر سجدہ کریں اور کبھی حصیر اور مصلی وغیرہ اپنے ساتھ لاتے ہیں اور اس پر سجدہ کرتے ہیں۔

ایران، عراق اور دیگر شیعہ نشین ممالک کی تمام مساجد میں چونکہ قالین بچھے ہوئے ہیں، اس لیے خاک سے "سجدہ گاہ" بنا کر اسے قالین پر رکھتے ہیں اور اس پر سجدہ کرتے ہیں تاکہ پیشانی کو کہ جو تمام اعضاء میں اشرف و افضل ہے اللہ تعالیٰ کے حضور، خاک پر رکھا جا سکے۔ اور اس ذات احدیت کی بارگاہ میں انتہائی تواضع و انکساری کا مظاہرہ کیا جا سکے۔ کبھی یہ "سجدہ گاہ"

شہداء کی تربت سے بنائی جاتی ہے تاکہ راہ خدا میں ان کی جانثاری کی یاد تازہ ہو اور نماز میں زیادہ سے زیادہ حضور قلب حاصل ہو سکے۔ اور پھر شہدائے کربلا کی تربت کو دوسری ہر قسم کی خاک پر ترجیح دی جاتی ہے لیکن شیعہ ہمیشہ اس تربت یا دوسری خاک کے پابند نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے مساجد کے صحنوں میں لگے ہوئے پتھروں (جیسے مسجد الحرام اور مسجد نبوی کے صحن والے سنگ مرمر) پر بھی با آسانی سجدہ کر لیتے ہیں (غور کیجئے)

بہر حال مکتب اہلبیت کے پاس زمین پر سجدہ کے وجوب کے بارے میں بہت سی ادلہ ہیں کہ منجملہ پیغمبر اکرمؐ کی احادیث، صحابہ کی سیرت جو آئندہ بحث میں بیان ہوگی اور آئمہ اطہارؑ سے نقل ہونے والی روایات کہ جنہیں ہم عنقریب نقل کریں گے۔

ہمیں تعجب یہ ہے کہ بعض اہلسنت برادران ہمارے اس فتویٰ کے مقابلے میں کیوں اتنے شدید ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کبھی اسے بدعت سے تعبیر کرتے ہیں حتیٰ بعض اوقات اسے کفر اور بت پرستی شمار کرتے ہیں۔

اگر ہم خود ان کی اپنی کتابوں سے ثابت کر دیں کہ رسولخداؐ اور ان کے اصحاب زمین پر سجدہ کرتے تھے تو کیا پھر بھی یہ عمل بدعت ہوگا؟

اگر ہم ثابت کر دیں کہ آنحضرتؐ کے بعض اصحاب جیسے جناب جابر ابن عبد اللہ انصاری وغیرہ جب شدید گرمی کی وجہ سے پتھر اور ریت گرم ہو جاتی تھی تو وہ کچھ مقدار ریت کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں تبدیل کرتے تھے تاکہ کچھ ٹھنڈی ہو جائے اور اس پر سجدہ کیا جا سکے"(۱) تو کیا اس صورت میں جناب جابر ابن عبد اللہ کو بت پرست یا بدعت گزار شمار کیا جائے گا؟!

۱۔ مسند احمد ج ۳ ص ۳۲۷، سنن بیہقی جلد ۱ ص ۴۳۹۔

پس جو شخص حصیر پر سجدہ کرتا ہے یا ترجیح دیتا ہے کہ مسجد الحرام یا مسجد نبویؐ کے فرش پر سجدہ کرے تو کیا وہ حصیر کی پرستش کرتا ہے یا مسجد کے فرش کی پوجا کرتا ہے؟!

کیا ضروری نہیں ہے کہ یہ دوران اس موضوع پر مشتمل ہماری ہزاروں فقہی کتابوں میں سے کم از کم ایک کتاب کا مطالعہ کریں تاکہ انہیں پتہ چل جائے کہ ان نادان الزامات میں ذرہ برابر بھی حقیقت کی جھلک نہیں ہے؟

کیا کسی پر بدعت یا کفر و بت پرستی کی تہمت لگانا کم گناہ ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آسانی سے معاف کر دیگا؟

اس بات کو جاننے کے لیے کہ کیوں شیعہ زمین پر سجدہ کرتے ہیں، امام صادق علیہ السلام کی اس حدیث کی طرف توجہ کافی ہے۔ ہشام بن حکم نے کہ جو امام کے خصوصی اصحاب میں سے تھے سوال کیا، کہ کس چیز پر سجدہ کیا جا سکتا ہے اور کس چیز پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے؟ امام نے جواب میں فرمایا" السجود لا یجوز الا علی الارض او ما انبتت الارض الا ما اکل او لبس" کسی چیز پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے مگر صرف زمین پر یا ان چیزوں پر جو زمین سے اگتی ہیں اور کھانے اور پہننے کے کام نہیں آتیں ہشام کہتا ہے میں نے عرض کی آپ پر قربان ہو جاؤں اس کی حکمت کیا ہے؟

آپ نے فرمایا "لان السجود ھو الخضوع للّٰہ عز و جل فلا ینبغی ان یکون علیٰ ما یؤکل و یلبس لان ابناء الدنیا عبید ما یاکلون و یلبسون و الساجد فی سجودہ فی عبادۃ اللّٰہ فلا ینبغی ان یضع جبھتہ فی سجودہ علی معبود ابناء الدنیا الذین اغترّوا بغرورھا" کیونکہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خضوع اور انکساری ہے اس لیے مناسب نہیں ہے کہ انسان کھانے اور پہننے کی چیزوں پر سجدہ کرے

کیونکہ دنیا پرست لوگ کھانے اور پہننے والی چیزوں کے بندے ہوتے ہیں۔ جبکہ وہ شخص جو سجدہ کر رہا ہے سجدہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہے پس مناسب نہیں ہے کہ انسان اپنی پیشانی کو سجدہ کی حالت میں ایسی چیزوں پر رکھے جو دنیا پرستوں کے معبود ہیں اور ان کی زرق و برق کے وہ فریفتہ ہیں۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے اضافہ فرمایا" و السجود علی الارض افضل لانہ ابلغ للتواضع و الخضوع للّٰہ عز و جل" کہ زمین پر سجدہ کرنا افضل ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور بہتر طور پر خضوع و تواضع اور انکساری کی علامت ہے۔(۱)

۴۔ مسئلہ کی ادلہ:

اب ہم اس مسئلہ کی ادلہ بیان کرتے ہیں۔ سب سے پہلے رسول اکرمؐ کے کلام سے شروع کرتے ہیں

الف) زمین پر سجدہ کے سلسلہ میں معروف حدیث نبوی

اس حدیث کو شیعہ و اہل سنت نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جعلت لی الارض مسجداً و طھوراً" کہ زمین میرے لیے محل سجدہ اور طہارت (تیمم) قرار دی گئی ہے"(۲)

بعض علماء نے یہ خیال کیا ہے کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ پوری روئے زمین اللہ کی عبادت کا مقام ہے۔ پس عبادت کا انجام دینا کسی معین مقام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے جیسا کہ یہود

۱) علل الشرائع، جلد ۲، ص ۳۴۱۔
۲) صحیح بخاری جلد ۱، ص ۹۱ و سنن بیہقی جلد ۲، ص ۴۳۳ (اور بہت سی دوسری کتابوں میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے)۔

ونصرانی کمس کرتے تھے کہ عبادت کو حتماً کلیساؤں اور عبادت خانوں میں انجام دینا چاہیے"۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفسیر حدیث کے حقیقی معنی کے ساتھ سازگار نہیں ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا "زمین طہور بھی ہے اور مسجد بھی" اور ہم جانتے ہیں کہ جو چیز طہور ہے اور جس پر تیمم کیا جاسکتا ہے وہ زمین کی خاک اور پتھر ہیں پس سجدہ گاہ کو بھی وہی خاک اور پتھر ہونا چاہیے۔

اگر پیغمبر اکرمؐ اس معنی کو بیان کرنا چاہتے کہ جسکا بعض اہلسنت کے علماء نے استفادہ کیا ہے تو یوں کہنا چاہیے تھا کہ "جعلت لی الارض مسجداً و ترابها طهوراً" یعنی سرزمین کو میرے لیے مسجد قرار دیا گیا اور اس کی خاک کو طہارت یعنی تیمم کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے" لیکن آپؐ نے یوں نہیں فرمایا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں سجدہ سے مراد جائے سجدہ ہے لہذا سجدہ گاہ کو بھی اسی چیز سے ہونا چاہیے جس پر تیمم ہو سکتا ہے۔

پس اگر شیعہ زمین پر سجدہ کرنے کے پابند اور قالین وغیرہ پر سجدہ کو جائز نہیں سمجھتے تو کوئی غلط کام نہیں کرتے بلکہ رسولخداؐ کے دستور پر عمل کرتے ہیں۔

ب) سیرت پیغمبرؐ:

متعدد روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ بھی زمین پر سجدہ کرتے تھے، کپڑا یا قالین وغیرہ پر سجدہ نہیں کرتے تھے۔

ابوہریرہ کی ایک حدیث میں یوں نقل ہوا ہے وہ کہتا ہے "سجد رسول اللهؐ فی یوم مطیر حتی انی لانظر الی اثر ذلک فی جبهته و ارنبته" میں نے رسولخداؐ کو ایک

بارانی دن زمین پر سجدہ کرتے ہوئے دیکھا۔ سجدہ کے آثار آپ کی پیشانی اور ناک پر نمایاں تھے(۱)

اگر سجدہ کپڑے یا دری وغیرہ پر جائز ہوتا تو ضرورت نہیں تھی کہ آنحضرتؐ بارش کے دن بھی زمین پر سجدہ کریں۔

حضرت عائشہ نیز فرماتی ہیں "ما رایت رسول الله متقیاً وجهه بشیء" میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آنحضرتؐ (سجدہ کے وقت) اپنی پیشانی کسی چیز سے ڈھانپ لیتے ہوں"(۲)

ابن حجر اس حدیث کی تشریح میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کیطرف اشارہ ہے کہ سجدہ میں اصل یہ ہے کہ پیشانی زمین پر لگے لیکن اگر قدرت نہ ہو تو پھر یہ واجب نہیں ہے(۳)

ایک دوسری روایت میں جناب میمونہ (رسول اکرمؐ کی ایک دوسری زوجہ) سے یوں نقل ہوا ہے کہ "و رسول الله یصلی علی الخمرة فیسجد" پیغمبر اکرمؐ حصیر (چٹائی) پر نماز پڑھتے اور اس پر سجدہ کرتے تھے۔

اہلسنت کی معروف کتب میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ "خمرہ" پر نماز پڑھتے تھے (خمرہ اس چھوٹے سے مصلی یا حصیر کو کہتے ہیں جو کھجور کے پتوں سے بنایا جاتا تھا) تعجب یہ ہے کہ اگر شیعہ اسی طرح عمل کریں اور نماز پڑھتے وقت کوئی مصلی بچھالیں تو ان پر بعض متعصب لوگوں کی طرف سے بدعت کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ اور غصے کے ساتھ انہیں

۱۔ [illegible] ص۱۲۹
۲۔ [illegible] ۲۹۷
۳۔ [illegible] ص ۴۰۴

دیکھا جاتا ہے۔

حالانکہ یہ احادیث بتاتی ہیں کہ یہ کام پیغمبر اکرمؐ کی سنت ہے۔

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ سنت کو بدعت شمار کیا جائے!

مجھے نہیں بھولتا کہ ایک مرتبہ حج کے موقع پر مدینہ میں، میں مسجد نبویؐ میں ایک چھوٹی سی چٹائی پر نماز پڑھنا چاہتا تھا تو ایک متعصب وہابی عالم دین آیا اور اس نے بڑے غصے کے ساتھ چٹائی اٹھا کر کونے میں پھینک دی گویا وہ بھی اس سنت کو بدعت سمجھتا تھا۔

ج) صحابہ اور تابعین کی سیرت

اس بحث میں دلچسپ موضوع یہ ہے کہ اگر ہم اصحاب اور انکے بعد آنے والے افراد (یعنی تابعین) کے حالات کا غور سے مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے وہ بھی زمین پر سجدہ کرتے تھے مثال کے طور پر

۱۔ جابر ابن عبداللہ انصاری فرماتے ہیں "کنت أصلی مع النبی الظهر فآخذ قبضة من الحصی فاجعلها فی کفی ثم احولها الی الکف الأخری حتی تبرد ثم اضعها لجبینی حتی اسجد علیها من شدة الحر" میں پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ نماز ظہر پڑھتا تھا۔ شدید گرمی کی وجہ سے کچھ سنگریزے ہاتھ میں لے لیتا تھا اور انہیں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں تبدیل کرتا رہتا تھا تاکہ وہ کچھ ٹھنڈے ہو جائیں اور ان پر سجدہ کرسکوں یہ کام گرمی کی شدت کی وجہ سے تھا"(۱)

.....

۱) مسند احمد، جلد ۳، ص ۳۲۷، سنن بیہقی، جلد ۱، ص ۴۳۹۔

اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ اصحاب پیغمبرؐ زمین پر سجدہ کرنے کے پابند تھے، حتیٰ شدید گرمی میں بھی اس کام کے لیے راہ حل تلاش کرتے تھے۔ اگر یہ کام ضروری نہ ہوتا تو یہ زحمت کی ضرورت نہیں تھی۔

۲۔ انس بن مالک کہتے ہیں "کنا مع رسول اللهؐ فی شدة الحر فیاخذ احدنا الحصباء فی یده فاذا برد وضعه و سجد علیه" ہم شدید گرمی میں رسول خداؐ کے ساتھ تھے ہم میں سے بعض لوگ کچھ سنگریزے ہاتھ میں لے لیتے تھے تاکہ ٹھنڈے ہو جائیں پھر انہیں زمین پر رکھ کر ان کے اوپر سجدہ کرتے تھے۔(۱)

یہ تعبیر بھی بتاتی ہے کہ یہ کام اصحاب کے درمیان رائج تھا۔

۳۔ ابو عبیدہ نقل کرتے ہیں "ان ابن مسعود لا یسجد او قال لا یصلی۔ الا علی الارض" کہ جناب عبداللہ ابن مسعود صرف زمین پر سجدہ کرتے تھے یا یوں کہا کہ صرف زمین پر نماز پڑھتے تھے۔(۲)

اگر زمین سے قالین یا دری وغیرہ مراد ہوتی تو کہنے کی ضرورت نہیں تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمین سے وہی خاک، ریت اور سنگریزے وغیرہ مراد ہیں۔

۴۔ عبداللہ ابن مسعود کے ایک دوست مسروق بن اجدع کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ "کان لا یرخص فی السجود علی غیر الارض حتی فی السفینة وکان یحمل فی السفینة شیئاً یسجد علیه" وہ سوائے زمین کے کسی شے پر سجدہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے حتیٰ اگر کشتی میں سوار ہوتا ہوتا تو کوئی چیز اپنے ساتھ کشتی میں رکھ لیتے تھے جس پر

۱) السنن الکبریٰ بیہقی، جلد ۲، ص ۱۰۶۔

۲) مصنف ابن ابی شیبہ، جلد ۲، ص ۱۷۲۔

پر سجدہ کرتے"(۱)

۵۔ جناب علی ابن عبداللہ ابن عباس نے "رزین" کو خط میں لکھا "ابعث الیّ بلوح من احجار المروۃ علیہ اسجد" کہ مروہ کے پتھروں میں سے ایک صاف پتھر میرے لیے بھیجنا تاکہ میں اس پر سجدہ کرسکوں"(۲)

۶۔ کتاب فتح الباری (شرح صحیح بخاری) میں نقل ہوا ہے کہ "کان عمر بن عبدالعزیز لا یکتفی بالخمرۃ بل یضع علیها التراب و یسجد علیه" عمر ابن عبدالعزیز نماز کے لیے صرف چٹائی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس پر مٹی رکھ لیتے اور اس پر سجدہ کرتے تھے۔(۳)

ان تمام روایات سے کیا سمجھ میں آتا ہے؟ کیا یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ اصحاب اور ان کے بعد آنے والے افراد کی (ابتدائی صدیوں میں) یہی سیرت تھی کہ زمین پر یعنی خاک، پتھر ریت اور سنگریزوں وغیرہ پر سجدہ کرتے تھے۔

اگر آج ہمارے زمانے میں کچھ مسلمان اس سنت کو زندہ رکھنا چاہیں تو کیا اسے بدعت کے عنوان سے یاد کیا جائے؟!

کیا فقہائے اہل سنت کو نہیں چاہیے کہ قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس سنت نبوی کو زندہ کریں، وہی کام جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی خضوع، انکساری اور عاجزی سے حکایت کرتا ہے اور سجدہ کی حقیقت کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔ (ایسے دن کی امید کے ساتھ)۔

۱) طبقات الکبریٰ، ابن سعد، جلد ۶، ص ۵۳۔
۲) اخبار مکہ ازرقی، جلد ۲، ص ۱۵۱۔
۳) فتح الباری، جلد ۱، ص ۴۱۰۔

۷

جمع بین صلاتین

بیان مسئلہ:

نماز خالق اور مخلوق کے درمیان ایک اہم ترین رابطہ اور تربیت کے ایک اعلیٰ ترین [illegible] عمل کا نام ہے۔ نماز خودسازی اور تزکیہ نفوس کا ایک بہترین وسیلہ اور فحشاء و منکر سے روکنے والے عمل کا نام ہے۔ نماز قرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔

اور باجماعت نماز مسلمانوں کی قوت و قدرت اور انکی صفوف میں وحدت کا مظہر اور سارے معاشرے کے لیے افتخار زندگی کا باعث ہے۔

نماز اصولی طور پر دن رات میں پانچ مرتبہ انجام دی جاتی ہے جس سے انسان کے دل و جان ہمیشہ فیض الٰہی کے چشمۂ زلال سے دھلتے رہتے ہیں۔

نماز کو رسول خدا نے اپنی آنکھوں کا نور قرار دیا اور اس کے لیے "**قرة عيني في الصلاة**" (۱) ارشاد فرمایا اور اسے مؤمن کی معراج شمار کرتے ہوئے "**الصلوة معراج المؤمن**" (۲) کی صدا بلند کی اور اسے متقین کے لیے قرب الٰہی کے وسیلے کے عنوان سے

۱) مکارم الاخلاق، ص ۴۶۱۔

۲) اگرچہ یہ جملہ کتب احادیث میں نہیں ملا لیکن اتنا مشہور ہے کہ علامہ مجلسی نے اپنے بیانات کے دوران اس جملے سے استشہاد فرمایا ہے (بحار الانوار، جلد ۷۹، ص ۲۴۸، ۳۰۳)۔

متعارف کرایا "الصلاۃ قربان کلی تقی" (۱)

اس مقام پر موضوع سخن یہ ہے کہ کیا پنج نمازوں کا پانچ اوقات میں علیحدہ علیحدہ انجام دینا ایک واجبی حکم ہے؟ اور اس کے بغیر نماز باطل ہو جاتی ہے (مسطرح وقت سے پہلے نماز پڑھ لینا اس کے باطل ہونے کا سبب بنتا ہے) یا سے تین وقتوں میں انجام دیا جا سکتا ہے؟ (یعنی ظہر و عصر کی نماز اور مغرب و عشاء کی نماز کو جمع کر کے ادا کیا جائے) علمائے شیعہ۔ مکتب اہلبیتؑ کی پیروی کرتے ہوئے۔ عموماً اس بات پر اتفاق نظر رکھتے ہیں کہ پانچ نمازوں کو تین وقتوں میں انجام دینا جائز ہے اگر چہ افضل و بہتر یہ ہے کہ نماز پنجگانہ کو پانچ وقتوں میں انجام دیا جائے۔

لیکن علمائے اہلسنت کی اکثریت۔ سوائے چند ایک کے۔ اس بات کی قائل ہے کہ نماز پنجگانہ کو علیحدہ علیحدہ پانچ اوقات میں انجام دینا واجب ہے (صرف عرفہ کے دن میدان عرفات میں ظہر و عصر کی نمازوں کو اکٹھا پڑھا جا سکتا ہے اور عید قربان کی رات مشعر الحرام میں مغرب و عشاء والی نماز کو اکٹھا بجا لایا جا سکتا ہے البتہ بہت سے علماء نے سفر اور بارش کے اوقات میں کہ جب نماز جماعت کے لیے مسجد میں رفت و آمد مشکل ہو دو نمازوں کو اکٹھا پڑھنے کی اجازت دی ہے)۔

شیعہ فقہاء کی نظر میں۔ جیسا کہ بیان ہوا۔ نماز پنجگانہ کے جدا جدا پڑھنے کی فضیلت پر تاکید کے ساتھ۔ نمازوں کو تین اوقات میں بجا لانے کی اجازت اور رخصت کو ایک عطیہ الٰہی شمار کیا جاتا ہے جسے امر نماز میں سہولت اور لوگوں کے لیے وسعت کی خاطر پیش کیا گیا ہے۔

۱) کافی جلد ۳، ص ۲۶۵، حدیث ۶۹۔

اور اس بات کو روح اسلام کے ساتھ سازگار سمجھا جاتا ہے کیونکہ اسلام ایک "شریعۃ سمحۃ و سھلۃ" (آسان و سہل) ہے۔

تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ نماز کے لیے پانچ وقتوں پر علیحدہ علیحدہ تاکید بھی اس بات کا سبب بنتی ہے کہ اصل نماز بالکل فراموش ہو جائے اور بعض لوگ نماز کو ترک کر دیں۔

اسلامی معاشروں میں پانچ اوقات پر اصرار کے آثار:

اسلام نے کیوں عرفہ کے دن ظہر و عصر کی نماز اور مشعر الحرام میں مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کرنے کی اجازت دی ہے؟

کیوں بہت سے اہلسنت فقہاء روایات نبوی کی روشنی میں سفر کے دوران اور بارش کے اوقات میں دو نمازوں کے اکٹھا پڑھنے کو جائز سمجھتے ہیں؟ یقیناً امت کی سہولت کی خاطر یہ احکام نازل ہوئے ہیں۔

یہ تسہیل تقاضا کرتی ہے کہ دیگر مشکلات میں بھی چاہے سابقہ زمانے میں ہوں یا اس دور میں۔ نماز کے جمع کرنے کی اجازت دینی چاہیے۔

ہمارے زمانے میں لوگوں کی زندگی تبدیل ہو چکی ہے۔ کارخانوں میں بہت سے مزدوروں، دفتروں میں بہت سے ملازمین اور کلاسوں میں بہت سے طالب علموں کو پانچ وقت نماز کی فرصت نہیں ملتی ہے یعنی انکے لیے کام کرنا کافی دشوار اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

پس ان روایات کے مطابق جو پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہیں اور آئمہ طاہرین نے ان پر تاکید کی ہے اگر لوگوں کو دو نمازوں کو اکٹھا پڑھنے کی اجازت دے دی جائے تو اس اعتبار سے

انکے کام میں سہولت حاصل ہوگی۔ اور نماز پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ جائیگی۔

اگر ایسا نہ کیا جائے تو ترک نماز میں اضافہ ہوگا اور تارک صلوٰۃ لوگوں کی تعداد بڑھتی جائیگی شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سے اہلسنت کے جوان نماز کو چھوڑ دیتے ہیں اور اہل تشیع میں تارکین نماز کی تعداد بہت کم ہے۔

اضافہ یہ ہے کہ "بعثت الی الشريعة السمحة السهلة" (۱) اور رسول اکرم سے نقل ہونے والی متعدد روایات کی روشنی میں لوگوں کو تین اوقات میں نماز پڑھنے کی اجازت دینی چاہیے اسی طرح فرادیٰ نماز کی بھی اجازت دینی چاہیے تا کہ زندگی کی مشکلات ترک نماز کا موجب نہ بنیں۔ اگر چہ اسلام میں پانچ وقت نماز کی فضیلت پر تاکید ہوئی ہے اور وہ بھی جماعت کے ساتھ۔

دو نمازوں کو اکٹھا پڑھنے کے جواز پر روایات:

اہلسنت کی معروف کتب جیسے صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ترمذی، موطاء مالک، مسند احمد، سنن نسائی، مصنف عبدالرزاق اور دیگر مشہور کتابوں میں تقریباً تیس ۳۰ روایات نقل کی گئی ہیں جن میں بغیر سفر اور مطر (بارش) کے، بغیر خوف اور ضرر کے، نماز ظہر و عصر یا نماز مغرب و عشاء کے اکٹھا پڑھنے کو نقل کیا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر روایات کو ان پانچ مشہور اصحاب نے نقل کیا ہے۔

۱۔ ابن عباس، ۲۔ جابر ابن عبداللہ انصاری، ۳۔ ابو ایوب انصاری، ۴۔ عبداللہ ابن عمر، ۵۔ ابو ہریرہ۔ ان میں سے بعض کو ہم قارئین محترم کے لیے نقل کرتے ہیں۔

(۱) مجھے یک کامل اور آسان شریعت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے (ترجمہ)۔

ابو زبیر نے سعید ابن جبیر سے انہوں نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ "صلى رسول الله الظهر و العصر جميعاً بالمدينة في غير خوف و لا سفر" رسول خدا نے مدینہ میں بغیر کسی خوف اور سفر کے نماز ظہر اور عصر کو اکٹھا انجام دیا۔

ابو الزبیر کہتے ہیں میں نے سعید ابن جبیر سے پوچھا کہ پیغمبر اکرمؐ نے ایسا کیوں کیا؟ تو وہ کہنے لگے کہ یہی سوال میں نے ابن عباس سے کیا تھا تو انہوں نے جواب میں کہا تھا "اراد ان لا يحرج احداً من امته" آنحضرت کا مقصد یہ تھا کہ میری امت کا کوئی مسلمان بھی زحمت میں نہ پڑے"(۱)

۲۔ ایک اور حدیث میں ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے "جمع رسول الله بين الظهر و العصر و المغرب و العشاء في المدينة في غير خوف و لا مطر" "پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ میں بغیر کسی خوف اور بارش کے نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء کو اکٹھا انجام دیا"۔

حدیث کے ذیل میں آیا ہے کہ جب ابن عباس سے سوال کیا گیا کہ پیغمبر اکرم کا اس جمع بین صلاتین سے کیا مقصد تھا تو انہوں نے جواب میں کہا "اراد ان لا يحرج" آنحضرت کا یہ مقصد تھا کہ کوئی مسلمان بھی زحمت و مشقت سے دوچار نہ ہو۔(۲)

۳۔ عبداللہ ابن شقیق کہتے ہیں

"خطبنا ابن عباس يوما بعد العصر حتى غربت الشمس و بدت النجوم و جعل الناس يقولون الصلاة، الصلاة! قال فجاءه رجل من بني تميم لا

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص [illegible]
(۲) صحیح مسلم جلد ۲ ص [illegible]

یفتر و لا ینثنی: الصلوة، الصلوة فقال ابن عباس اتعلمنی بالسنة لا ام لک ثم قال: رایت رسول الله جمع بین الظهر و العصر و المغرب و العشاء قال عبد الله بن شقیق: فحاک فی صدری من ذلک شیء فاتیت ابا هریرة فسالته، فصدق مقالته"(۱)

کہ ایک دن ابن عباس نے نماز عصر کے بعد خطبہ پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا اور ستارے ظاہر ہوگئے، لوگوں نے نماز، نماز کی آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ ایسے میں بنو تمیم قبیلہ کا ایک آدمی آیا وہ مسلسل نماز، نماز کی صدائیں بلند کر رہا تھا اس پر ابن عباس نے کہا تو مجھے سنت رسول سکھانا چاہتا ہے بے حسب ونسب! میں نے دیکھا ہے کہ رسول خداؐ نے نماز ظہر و عصر کو اسی طرح نماز مغرب و عشاء کو اکٹھا پڑھا ہے عبداللہ بن شقیق کہتا ہے میرے دل میں شک سا پیدا ہوگیا، میں ابو ہریرہ کے پاس آیا اور ان سے یہی بات دریافت کی انہوں نے ابن عباس کے کلام کی تصدیق کی۔

۴۔ جابر ابن زید لکھتے ہیں کہ ابن عباس نے کہا کہ "صلی النبی (ص) سبعاً جمیعاً و ثمانیاً جمیعاً" پیغمبر کرمؐ نے سات رکعتیں اور آٹھ رکعتیں اکٹھی پڑھیں"(مغرب اور عشاء کی نماز اسی طرح ظہر اور عصر کی نماز کے اکٹھے پڑھنے کی طرف اشارہ ہے)(۲)

۱) سابقہ مدرک۔
۲) صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۴۰ (باب وقت المغرب)۔

۵۔ سعید بن جبیر، ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ

"جمع رسول الله (صلی الله علیه وآله وسلم) بین الظهر و العصر و بین المغرب و العشاء بالمدینة من غیر خوف و لا مطر قال فقیل لابن عباس ما اراد بذلک؟ قال اراد ان لا یحرج امته"(۱)

"پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ میں بغیر دشمن کے خوف اور بارش کے ظہر و عصر کی نماز، اسی طرح مغرب و عشاء کی نمازوں کو اکٹھا پڑھا، ابن عباس سے پوچھا گیا کہ آنحضرتؐ کا اس کام سے کیا مقصد تھا؟ تو انہوں نے کہا آپؐ چاہتے تھے کہ ان کی امت مشقت میں نہ پڑے"

۶۔ امام احمد ابن حنبل نے بھی اسی کے مشابہ حدیث اپنی کتاب مسند میں ابن عباس سے نقل کی ہے۔(۲)

۷۔ امام مالک نے اپنی کتاب "موطا" میں مدینہ کا تذکرہ کیے بغیر ابن عباس سے یہ حدیث نقل کی ہے

"صلی رسول اللهؐ الظهر و العصر جمیعا و المغرب و العشاء جمیعا فی غیر خوف و لا مطر"(۳)

۱) صحیح ترمذی جلد ۱ ص ۱۲ حدیث ۱۸۷۔
۲) مسند احمد جلد ۱ ص ۲۲۳
۳) موطا مالک جلد ۱ ص ۱۴۴۔

"رسولِ خدا نے ظہر و عصر کی نماز کو اسی طرح مغرب و عشاء کی نماز کو اکٹھا پڑھا حالانکہ نہ تو دشمن کا خوف تھا اور نہ ہی بارش کا خطرہ"

۸۔ "مصنف عبد الرزاق" نامی کتاب میں جناب عبداللہ بن عمر سے نقل کیا گیا ہے کہ

"جمع لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم مقیما غیر مسافر بین الظھر و العصر فقال رجل لابن عمر: لم ترى النبی فعل ذلک؟ قال لأن لا یحرج امتہ ان جمع رجل" (۱)

پیغمبر اکرمؐ نے بغیر سفر کے یعنی قیام کی حالت میں ظہر و عصر کی نمازوں کو اکٹھا پڑھا، کسی نے ابن عمر سے پوچھا آپ کے خیال کے مطابق پیغمبر اکرمؐ نے یہ کام کیوں کیا؟ اس پر انہوں نے کہا آپؐ نے یہ کام اس لیے انجام دیا کہ امت میں سے کوئی ان دو نمازوں کو اکٹھا پڑھے تو زحمت میں مبتلا نہ ہو (لوگ اس پر اعتراض نہ کریں)۔

۹۔ جابر ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ

"جمع رسول اللہ (ص) بین الظھر و العصر و المغرب و العشاء فی المدینۃ للرخص من غیر خوف و لا علۃ" (۲)

"رسولِ خدا نے مدینہ میں بغیر دشمن کے خوف اور بغیر کسی عذر کے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کو اکٹھا پڑھا تاکہ امت کے لیے اجازت اور رخصت ہو جائے۔"

۱) مصنف عبدالرزاق، جلد ۲، ص ۵۵۶۔
۲) معانی الآثار، جلد ۱، ص ۱۶۱۔

۱۰۔ ابو ہریرہ نیز نقل کرتے ہیں کہ:

"جمع رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم) بین الصلوتین فی المدینۃ من غیر خوف" (۱)

رسولِ خدا نے مدینہ میں بغیر دشمن کے خوف کے دو نمازوں کو اکٹھا پڑھا۔

۱۱۔ عبداللہ بن مسعود بھی نقل کرتے ہیں کہ

"جمع رسول اللہ (ص) بین الاولی و العصر و المغرب و العشاء فقیل لہ فقال صنعتہ لئلا تکون امتی فی حرج" (۲)

رسولِ خدا نے مدینہ میں ظہر و عصر کی نماز، اسی طرح مغرب و عشاء کی نمازوں کو اکٹھا پڑھا کسی نے آپؐ سے اس کے سبب کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ کام میں نے اس لیے کیا ہے تاکہ میری امت مشقت میں نہ پڑے۔

اسی طرح اور بہت سی احادیث موجود ہیں جو اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

یہاں پر دو سوال پیش نظر ہیں

مذکورہ احادیث کا نتیجہ:

مذکورہ بالا تقریباً تمام احادیث میں "کہ جو اہلسنت کی مشہور اور درجہ اول کی کتب میں ذکر ہوئی ہیں اور ان کی سند بعض بزرگ اصحاب تک پہنچتی ہے" دو نکات پر تاکید کی گئی ہے۔

۱) مسند احمد، جلد ۲، ص ۲۴۲۔
۲) المعجم الکبیر طبرانی، جلد ۱۰، ص ۲۹، حدیث ۱۰۵۲۵۔

ایک تو یہ کہ رسولِ خداؐ نے دو نمازوں کو اس حال میں اکٹھا انجام دیا کہ کسی قسم کی مشکل جیسے دشمن کا خوف، سفر و بارش وغیرہ، درپیش نہیں تھی۔

اور دوسرے یہ کہ آپؐ کا مقصد "امت کو رخصت دینا" اور "عسر و حرج سے نجات دلانا" تھا۔

ان نکات کی روشنی میں سزاوار ہے کہ بعض لوگ اعتراض تراشی کریں اور یوں کہیں کہ یہ اکٹھا پڑھنا اضطراری موارد میں تھا؟ ہم کیوں حقائق سے چشم پوشی کریں، اور اپنے نام نظریات کو رسولِ خداؐ کے صریح فرامین پر ترجیح دیں؟!

خدا و رسولؐ نے اجازت دی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ امت کے بعض متعصب لوگ اجازت نہیں دیتے! آخر کیوں؟!

یہ لوگ کیوں نہیں چاہتے ہیں کہ مسلمان جوان ہر حال میں اور ہر جگہ پر، اسلامی ممالک کے اندر اور باہر، یونیورسٹیوں، دفتروں اور کارخانوں میں اس اہم ترین اسلامی فریضہ (یعنی یومیہ نمازوں) پر عمل کریں؟

ہمارا نظریہ ہے کہ اسلام قیامت تک ہر زمان اور ہر مکان کے لیے ہے۔

پیغمبر اکرمؐ یقیناً اپنی وسعت نظری کے ذریعہ تمام دنیا کے مسلمانوں اور تمام زمانوں اور صدیوں کے لوگوں کو مدنظر رکھے ہوئے تھے وہ جانتے تھے کہ اگر تمام لوگوں کو پانچ وقت میں نماز پڑھنے پر مقید کریں گے تو اس کے نتیجے میں بعض لوگ تارک الصلاۃ ہو جائیں گے (جیسا کہ ہم آجکل دیکھ رہے ہیں) اسی لیے انہوں نے اپنی امت پر احسان کیا اور کام کو آسان

کر دیا تاکہ سب لوگ ہر زمان و مکان میں آسانی کے ساتھ روزانہ کی نمازوں کو بجا لاسکیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے

"وما جعل علیکم فی الدین من حرج" (۱)

• قرآن مجید اور نماز کے تین اوقات:

اس مسئلہ میں تعجب کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی دو آیات میں جب نماز کے اوقات کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں یومیہ نمازوں کے لیے صرف تین اوقات ذکر کیے گئے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ کیوں ان بھائیوں میں سے ایک گروہ پانچ اوقات کے وجوب پر اصرار کرتا ہے۔

پانچ اوقات میں نماز کی زیادہ فضیلت کے بارے میں کسی کو انکار نہیں ہے۔ ہمیں بھی اگر توفیق بھی شامل حال رہے تو پانچ اوقات میں نماز ادا کرتے ہیں۔

اختلاف صرف ان پانچ اوقات کے وجوب کے بارے میں ہے۔

پہلی آیت سورۂ ہود میں ہے "واقم الصلوۃ طرفی النہار و زلفا من اللیل" "دن کے دو اطراف میں اور رات کے کچھ حصے میں نماز ادا کرو" (۲)

"طرفی النہار" نماز صبح کی طرف جو دن کی ابتداء میں انجام دی جاتی ہے، اور نماز ظہر و عصر کی طرف اشارہ ہے کہ جس کا وقت سورج غروب ہونے تک باقی ہے۔ بالفاظ دیگر نماز ظہر و عصر کے وقت کا غروب آفتاب تک باقی رہنا اس آیت سے با آسانی استفادہ ہوتا ہے۔

"زلفا من اللیل" کہ جس میں لفظ "زلف" استعمال ہوا ہے جس کے بارے میں "مختار

(۱) سورۂ حج آیت ۷۸، اور اللہ نے تم پر دین کے مسئلے میں کوئی حرج اور مشقت نہیں رکھی۔
(۲) سورۂ ہود آیت ۱۱۴۔

الصحاح" اور راغب نے کتاب المفردات میں لکھا ہے کہ یہ "زلفة" کی جمع ہے جو رات کے ابتدائی حصوں کے بارے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ "زلفاً من اللیل" مغرب اور عشاء کے وقت کی طرف اشارہ ہے۔

بنابرایں، اگر پیغمبر اکرم نمازوں کو عام طور پر پانچ وقتوں میں انجام دیتے تھے تو وہ یقیناً ان پانچ اوقات کی فضیلت کے اعتبار سے تھا کہ جس کے ہم سب معتقد ہیں ہم کیوں قرآن مجید کی آیت کے ظہور سے چشم پوشی کریں اور دوسری تاویلوں کو تلاش کریں؟!

۲۔ دوسری آیت سورہ، اسراء میں ہے: "اقم الصلوة لدلوک الشمس الی غسق اللیل و قرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشهودا" نماز کو زوال آفتاب کے آغاز سے رات کی تاریکی تک ادا کرو اسی طرح قرآن فجر (نماز صبح) ادا کرو "(۱)

"دلوک" متمایل ہونے اور جھکنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں نصف النہار سے سورج کے تمایل کی طرف اشارہ ہے یعنی زوال کا وقت۔

"غسق اللیل" رات کی تاریکی کے معنی میں ہے، بعض نے اسے رات کی ابتداء سے تعبیر کیا ہے اور بعض نے آدھی رات کے معنی میں اس کی تفسیر کی ہے۔ جیسا کہ راغب نے "مفردات" میں لکھا ہے کہ "غسق" رات کی تاریکی کی شدت کے معنی میں ہے اور یہ وہی آدھی رات کے وقت ہوتی ہے۔

ان معانی کے مطابق دلوک شمس سے نماز ظہر و عصر کے وقت کی ابتداء کی طرف اشارہ ہے اور غسق اللیل سے نماز مغرب و عشاء کے وقت کی انتہا کی طرف اشارہ ہے اور قرآن فجر سے

(۱) سورۂ اسراء، آیت ۷۸۔

نماز صبح کی طرف اشارہ ہے۔

جناب فخر رازی نے اس آیت کی بہترین تفسیر بیان کی ہے وہ یوں رقمطراز ہیں کہ:

"ان فسرنا الغسق بظهور اول الظلمة، و حكاه عن ابن عباس و عطا و النضر بن شميل، كان الغسق عبارة عن اول المغرب و على هذا التقدير يكون المذكور في الآية ثلاث اوقات وقت الزوال و وقت اول المغرب و وقت الفجر، و هذا يقتضي ان يكون الزوال وقتا للظهر و العصر فيكون هذا الوقت مشتركا بين الصلوتين و ان يكون اول المغرب وقتا للمغرب و العشاء فيكون هذا الوقت مشتركا ايضا بين هاتين الصلوتين فهذا يقتضي جواز الجمع بين الظهر و العصر و المغرب و العشاء مطلقا"(۱)

اگر ہم کلمہ غسق کو رات کی تاریکی کے آغاز کے معنی میں تعبیر کریں (جیسا کہ ابن عباس عطاء اور نضر بن شمیل بھی اسی کے قائل ہیں) تو اس وقت غسق سے مغرب کے ابتدائی وقت کی طرف اشارہ ہوگا۔ اور اس بناء پر آیت میں تین اوقات ذکر

(۱) تفسیر کبیر فخر رازی، ج۲۱، ص۲۷۔

ہوتے ہیں زوال کا وقت۔ غروب کا وقت اور فجر کا وقت۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ یہ تین اوقات تقاضا کرتے ہیں کہ زوال نماز ظہر و عصر کا مشترک اور غروب نماز مغرب و عشاء کا مشترک وقت ہو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نماز ظہر اور عصر کو، اسی طرح نماز مغرب اور عشاء کو بغیر کسی قید و شرط کے اکٹھا پڑھا جا سکتا ہے"

جناب فخر رازی نے یہاں تک تو بالکل صحیح بات بیان کی تھی اور آیت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھا اور سمجھایا۔ لیکن اس کے بعد کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارے پاس دلیل موجود ہے کہ دو نمازوں کے درمیان بغیر عذر و سفر کے جمع کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے ہم آیت کو عذر کی حالت میں محدود کریں گے۔ ( )

موصوف کو یاد دہانی کرانی چاہیے کہ نہ صرف یہ کہ ہمارے پاس آیت کو صرف حالِ عذر میں محدود کرنے پر دلیل موجود نہیں ہے بلکہ متعدد روایات موجود ہیں (جن کی طرف اشارہ ہو چکا ہے) کہ رسولِ خداؐ نے بغیر عذر اور بغیر سفر کے نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء کو اکٹھا پڑھا تاکہ امت کو سہولت دی جا سکے اور وہ اس رخصت سے بہرہ مند ہو سکیں۔

علاوہ بر این آیت کے اطلاق کو کس طرح استثنائی محدود موارد کے ساتھ مختص کیا جا سکتا ہے حالانکہ علمِ اصول میں یہ بات مسلّم ہے کہ تخصیص اکثر جائز نہیں ہے۔

بہرحال آیت نے بالکل وضاحت کے ساتھ نماز کے جو تین اوقات ذکر کیے ہیں ان سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی ہے۔

سابقہ بیان سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں۔

۱) سابقہ مدرک۔

۱۔ قرآن مجید نے وضاحت کے ساتھ پانچ نمازوں کی تین اوقات میں بجا آوری کو جائز قرار دیا ہے۔

۲۔ فریقین کی کتب میں بیان کی جانے والی اسلامی احادیث سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے کئی مرتبہ دو نمازوں کو اکٹھا پڑھا حالانکہ نہ ہی سفر میں تھے اور نہ ہی کوئی اور عذر تھا۔ اور اس کام کو انہوں نے مسلمانوں کے لیے رخصت شمار کیا تاکہ وہ مشقت سے دوچار نہ ہوں۔

۳۔ اگرچہ پانچ اوقات میں نماز پڑھنا فضیلت ہے، لیکن اس فضیلت پر اصرار کرنے اور جمع کی راہ میں رکاوٹ بننے کی وجہ سے بہت سے لوگ بالخصوص جوان نسل اصل نماز سے فرار کر جاتے ہیں۔ اور اس بات کی تمام ذمہ داری تجمیع کے مخالفین کے دوش پر آتی ہے۔

کم از کم اہلسنت علماء یہ تو قبول کر لیں کہ اس مسئلہ میں انکے جوان بھی کتب اہلبیتؑ کے طرفداروں کے فتویٰ پر عمل کریں جیسا کہ بزرگ عالم دین شیخ الازہر" جناب شیخ محمود شلتوت" نے مذہب جعفریہ کے تمام فتاویٰ پر عمل کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔

آخر میں پھر ہم دوبارہ تاکید کرتے ہیں۔ کہ ہمیں قبول کرنا چاہیے کہ آج کل دنیا میں بہت سے مزدوروں، ملازمین، سکول و کالجز کے طلاب اور دیگر طبقات کے لوگوں کے لیے پانچ اوقات میں علیحدہ علیحدہ نماز پڑھنا بہت مشکل کام ہے۔ کیا ہمیں نہیں چاہیے کہ رسولِ خداؐ کی دی گئی اس سہولت سے استفادہ کریں جو آجکل کے معاشرے کو مدنظر رکھتے ہوئے عنایت کی گئی ہے تاکہ نسل جوان اور دیگر لوگ نماز ترک کرنے کے بہانے نہ بنائیں۔

کیا "سنت" پر اس حد تک اصرار کرنا صحیح ہے کہ جو "فریضہ" کے ترک کرنے کا سبب

۸

وضو میں پاؤں کا مسح

قرآن مجید اور پاؤں کا مسح:

وضو میں پاؤں کا مسح ایک اور ایسا اعتراض ہے جسے اہلسنت کے بعض علماء، شیعوں پر کرتے ہیں۔ چونکہ ان کی اکثریت پاؤں دھونے کو واجب سمجھتی ہیں اور پاؤں کے مسح کو کافی نہیں سمجھتی۔

جبکہ قرآن مجید نے بالکل واضح الفاظ میں پاؤں کے مسح کا حکم دیا ہے۔ اس طرح مکتب اہلبیت کے پیروکاروں کا عمل قرآن مجید کے بالکل مطابق ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبر اکرمؐ کی بہت سی احادیث جن کی تعداد تقریباً تیس (۳۰) سے بھی زیادہ ہے پاؤں کے مسح کو بیان کرتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ بہت سے اصحاب اور تابعین (وہ لوگ جو اصحاب کے بعد والے زمانے میں تھے) کا عمل پاؤں کے مسح کے بارے میں موجود ہے نہ پاؤں دھونے کے بارے میں۔

لیکن مقام افسوس ہے کہ بعض مخالفین نے ان تمام ادلہ سے چشم پوشی کرتے ہوئے، بغیر کسی غور وفکر کے، ہم پر حملہ کرنا شروع کر دیا اور تند و تیز الفاظ کے ذریعے، حق و عدالت سے دوری اختیار کرتے ہوئے اس مذہب حقہ کے پیروکاروں کی سرزنش شروع کر دی ہے۔ ابن کثیر مذہب اہلسنت کے معروف عالم دین اپنی کتاب "تفسیر القرآن العظیم" میں کہتے ہیں۔

"روافض (ان کا مقصود اہلبیت کے پیروکار ہیں) نے وضو میں پاؤں دھونے کے مسئلے میں مخالفت کی ہے اور جہالت و گمراہی کی وجہ سے بغیر کسی دلیل کے مسح کو کافی سمجھ لیا ہے حالانکہ قرآن مجید کی آیت سے پاؤں دھونے کا وجوب سمجھا جاتا ہے۔ اور رسولخداؐ کا عمل بھی آیت کے مطابق تھا۔ حقیقت میں ان کے پاس اپنے نظریہ پر کوئی دلیل نہیں ہے!!"(۱)

بعض دیگر علماء نے بھی انکی اندھی تقلید کرتے ہوئے انکی بات کو اخذ کر لیا ہے اور اس مسئلہ پر تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور اپنی دلخواہ نسبت شیعوں کی طرف دی ہے۔

شاید وہ اپنے تمام مخالفین کو عوام تصور کر رہے تھے اور انہوں نے یہ نہ سوچا کہ ایک دن محققین انکی باتوں پر تنقید کریں گے اور (انہیں باطل ثابت کریں گے) اس طرح انہیں اسلامی تاریخ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔

اس وقت ہم سب سے پہلے قرآن مجید کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور اس مسئلہ کا فیصلہ دریافت کرتے ہیں۔ سورۂ مائدہ (کہ جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی سب سے آخری سورت ہے) کی آیت نمبر ۶ میں یوں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یا ایھا الذین آمنوا اذا قمتم الی الصلوٰۃ
فاغسلوا وجوھکم و ایدیکم الی المرافق و
امسحوا برءوسکم و ارجلکم الی الکعبین"

اے صاحبان ایمان جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور اپنے سر اور پاؤں کا ابھری ہوئی جگہ تک مسح کرو"

---

(۱) تفسیر القرآن العظیم جلد ۲ ص ۴۴۔

واضح ہے کہ کلمہ "ارجلکم" (اپنے پاؤں) کا کلمہ "رؤسکم" (اپنے سر) پر عطف ہے اور اس وجہ سے دونوں کا مسح کرنا واجب ہے خواہ "ارجلکم" کو نصب کے ساتھ پڑھا جائے یا جر کے ساتھ (غور کیجئے)(۱)

---

(۱) اس مطلب کی وضاحت یہ ہے کہ کلمہ "ارجلکم" کے اعراب کے بارے میں دو مشہور قرائتیں ہیں ایک جر کے ساتھ قرائت کرتے ہیں بعض مشہور قراء جیسے حمزہ، ابو عمرو، ابن کثیر اور حتی عاصم (ابوبکر کی روایت کے مطابق) اس کو جر کے ساتھ پڑھتے ہیں اور دوسری طرف بعض مشہور قراء اسے نصب کے ساتھ پڑھتے ہیں اور آجکل قرآن مجید کے رائج نسخوں میں اسی دوسری قرائت کے مطابق اعراب لگایا گیا ہے۔

لیکن دونوں اعراب کے مطابق یقیناً معنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر جر کے ساتھ پڑھا جائے تو بالکل واضح ہے کہ "ارجلکم" کا "رؤسکم" پر عطف ہے اس کا معنی یہ ہے کہ وضو میں پاؤں کا مسح کرو (جیسا کہ سر کا مسح کرتے ہو) [illegible] قرائت کے مطابق عمل [illegible] کہ جس کے اوپر بھی بہت سے علماء ہیں تو اس میں کیا عیب ہے؟

اور اس سے بڑھ کر اگر فتح (زبر) کے ساتھ بھی پڑھا جائے پھر بھی "ارجلکم" کا عطف "برؤسکم" کے محل پر ہوگا اور واضح ہے "برؤسکم" محل کے اعتبار سے منصوب ہے کیونکہ "وامسحوا" کا مفعول ہے۔ پس دونوں صورتوں میں آیت کا معنی یہی ہے کہ پاؤں کا مسح کرو۔

بعض لوگوں نے یوں خیال کیا ہے کہ "ارجلکم" کو فتح (زبر) کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا "وجوھکم" پر عطف ہوگا یعنی ہاتھ اور منہ کو دھوئیے اس طرح پاؤں کو دھو لیجئے! حالانکہ یہ بات ادبیات عرب کے قواعد کے بھی خلاف اور قرآن مجید کی فصاحت کے ساتھ بھی سازگار نہیں ہے۔

یہ عطف یہ بات ادبیات عرب کے اس لئے خلاف ہے کیونکہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان کبھی اجنبی جملہ فاصلہ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ایک معروف ادیب عالم کے بقول محال ہے کہ "ارجلکم" کا "وجوھکم" پر عطف ہو کیونکہ ہرگز فصیح عربی میں ایسا جملہ نہیں بولا جاتا ہے کہ مثلاً کوئی کہے "ضربت زیداً و مررت بکر و عمراً" کہ میں نے زید کو مارا اور بکر کے قریب سے گزرا اور عمرو کو یعنی عمرو کو بھی مارا!! (شرح منیۃ المصلی ص ۱۶)

بہر حال قرآن مجید نے پاؤں کے بارے میں مسح کا حکم دیا ہے۔

عجیب توجیہات

بعض لوگوں نے جب قرآن مجید کے حکم کو اپنے پہلے سے معین کردہ مفروضہ کے خلاف دیکھا تو توجیہات کرنا شروع کر دیں۔ ایسی توجیہات کہ جو انسان کو حیران کر دیتی ہیں۔ من جملہ

۱۔ یہ آیت سنت پیغمبرؐ کی وجہ سے اور جو احادیث "آپؐ" سے نقل ہوئی ہیں ان کی خاطر منسوخ ہو گئی ہو! ابن حزم نے اپنی کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں لکھا ہے کہ "چونکہ سنت میں پاؤں دھونے کا حکم آیا ہے اس لیے ہمیں قبول کرنا چاہیے کہ مسح والا حکم منسوخ ہو گیا ہے"۔

جبکہ اولاً: تمام مفسرین نے اس بات کو قبول کیا ہے کہ سورہ مائدہ وہ آخری سورہ ہے جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئی ہے اور اس کی کوئی بھی آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔

حتی کہ عام افراد بھی اس قسم کا جملہ نہیں بولتے ہیں چہ جائیکہ قرآن مجید جو فصاحت کی اعلیٰ ترین مثال ہے ایسی قسم کا جملہ بیان کرے۔

پس جس طرح اہلسنت کے بعض محققین نے کہا ہے کہ بلا شک و شبہ نصب کی صورت میں بھی "وجوهکم" پر عطف "برءوسکم" کے محل پر ہوگا اور ہر حال میں آیت کا مفہوم یہی ہے کہ کوئی وضو کرتے وقت سر اور پاؤں کا مسح کرے۔

ثانیاً جس طرح عنقریب بیان کیا جائیگا کہ جہاں پیغمبر اکرمؐ سے وضو میں پاؤں دھونے والی روایات نقل ہوئی ہیں ان کے مقابلے میں آپؐ سے ہی متعدد روایات پاؤں کے مسح کے بارے میں بھی نقل ہوئی ہیں کہ آپؐ وضو میں پاؤں کا مسح کیا کرتے تھے۔

کس طرح ممکن ہے کہ ہم قرآن مجید کے دستور کو اس قسم کی روایات کے ذریعے منسوخ کریں۔

علاوہ بر این متعارض روایات کے باب میں ثابت کیا گیا ہے کہ جب بھی روایات کے درمیان تضاد ہو تو قرآن مجید سے ان کی مطابقت کرنی چاہیے، جو روایات قرآن مجید کے مطابق ہوں انہیں قبول کر لینا چاہیے اور جو قرآن مجید کے مخالف ہوں ان پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ دوسرے کچھ افراد جیسے "جصاص" نے "احکام القرآن" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ "وضو والی آیت مجمل ہے اور ہم احتیاط پر عمل کرتے ہوئے پاؤں دھو لیتے ہیں تاکہ دھونا بھی صادق آ جائے اور مسح بھی"(۱)

حالانکہ سب جانتے ہیں کہ (غسل) "دھونا" اور "مسح کرنا" دو مختلف و متباین مفہوم ہیں اور دھونا ہرگز مسح کو شامل نہیں ہوتا ہے۔

لیکن کیا کیا جائے ایسی پہلے سے تعصبات انہیں قرآن مجید کے ظہور پر عمل نہیں کرنے دیتی۔

۱) احکام القرآن، جلد ۲، ص ۳۴۳

۳۔ جناب فخر رازی کہتے ہیں کہ حتیٰ اگر "جر" کے ساتھ بھی قرأت کی جائے یعنی "ارجلکم" کا "رؤوسکم" پر عطف کیا جائے تو بالکل واضح طور پر یہ پاؤں کے مسح پر دلالت کرتا ہے، لیکن پھر بھی اس کا مقصد پاؤں کا مسح کرنا نہیں ہوگا، بلکہ پاؤں کے مسح سے مراد یہ ہوگی کہ پاؤں دھوتے وقت پانی استعمال کرنے میں اسراف نہ کرو"(۱)

حالانکہ اگر آیات قرآن میں اس قسم کے اجتہاد اور تفسیر بالرای کا دروازہ کھل جائے تو پھر ظواہر قرآن پر عمل کرنے کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔ اگر ہمیں اجازت ہو کہ ہم "مسح" کو "دھوتے وقت اسراف نہ کرنے" کے معنی میں لے لیں تو پھر تمام آیات کے ظواہر کی دوسری طرح تفسیر کی جا سکتی ہے۔

نص کے مقابلے میں اجتہاد اور تفسیر بالرای:

بہت سے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے زمانے میں اجتہاد در مقابل نص ایک قبیح اور غیر قابل قبول امر سمجھا جاتا ہے، اسلام کے ابتدائی زمانے میں اس طرح نہیں تھا بالفاظ دیگر جس طرح آج ہم احادیث پیغمبرؐ اور آیات قرآن کے مقابلے میں تعبد اور تسلیم محض رکھتے ہیں۔ اُس زمانے میں یہ تعبد اس شدت وقوت کے ساتھ نہیں تھا۔

مثلاً جب حضرت عمر نے اپنے معروف جملے میں یوں کہا کہ "متعتان کانتا محللتان فی زمن النبیؐ و أنا احرمهما و اعاقب علیهما متعة النساء و متعة الحج" تو

۱) تفسیر کشاف، جلد ۱، ص ۶۱۰۔

جیسے رسولؐ کے زمانے میں حلال تھے میں ان دونوں کو حرام کرتا ہوں اور جو بھی اس حکم کی مخالفت کرے گا میں اسے سزا دوں گا، ایک متعة النساء اور دوسرا متعۂ حج(۱) (یعنی حج تمتع اپنے خاص احکام کے ساتھ) تو بہت کم یہ منظر دیکھنے میں نہیں آتا ہے کہ اصحاب میں سے کسی نے ان پر تنقید کی ہو اور کہا ہو کہ نص کے مقابلے میں اجتہاد جائز نہیں ہے (اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ)۔

حالانکہ اگر ہمارے زمانے میں کوئی بڑے سے بڑا مسلمان فقیہ یا دانشمند کہہ دے کہ "فلاں عمل رسولؐ کے زمانے میں حلال تھا اور میں اسے حرام کر رہا ہوں" سب اس پر تعجب کریں گے اور اس کی بات کو فضول اور غیر قابل قبول سمجھیں گے اور جواب میں کہیں گے کہ کسی کو بھی حق نہیں ہے کہ حرام خدا کو حلال یا حلال خدا کو حرام کرے کیونکہ احکام کو منسوخ کرنا یا نص کے مقابلے میں اجتہاد کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

لیکن اسلام کے ابتدائی زمانے میں اس طرح نہیں تھا۔ اسی لیے بعض موارد دیکھنے کو ملتے ہیں کہ جس میں صحابہ احکام الٰہی کے مقابلے میں مخالفت کی جرأت کرتے تھے۔

شاید پاؤں پر مسح کے انکار اور اسے دھونے میں تبدیل کرنے کا مسئلہ بھی اسی اجتہاد کا شکار ہوا ہوگا۔ شاید بعض لوگوں نے سوچا ہوگا کہ پاؤں چونکہ آلودگی کے نزدیک رہتے ہیں بہتر ہے کہ انہیں دھولیا جائے چونکہ ان کے مسح کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

بالخصوص اُس زمانے میں تو بعض لوگ ننگے پاؤں رہتے تھے اور بالکل جوتے نہیں پہنتے تھے اسی وجہ سے آداب احترام مہمان میں سے ایک یہ تھی کہ گھر میں داخل ہوتے وقت اس کے پاؤں دھلواتے تھے۔

۱) اس حدیث کے مصادر، نکاح موقت کی بحث میں بیان ہو چکے ہیں۔

ہماری اس بات پر گواہ صاحب تفسیر المنار کا کلام ہے جسے انہوں نے آیت وضو کے ذیل میں پاؤں دھونے کے قائل افراد کی توجیہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "پاؤں پر تر ہاتھ کھینچ دینے سے کہ جو اکثر اوقات غبار آلود اور کثیف ہوتے ہیں نہ صرف کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ پاؤں زیادہ کثیف ہو جاتے ہیں اور ہاتھ بھی آلودہ اور کثیف ہو جاتا ہے۔

اور اہلسنت کے معروف فقیہ ابن قدامہ (متوفی ۶۲۰ ھ ق) بعض علماء سے نقل کرتے ہیں کہ پاؤں چونکہ گندگی کے نزدیک ہیں جبکہ سر اس طرح نہیں ہے لہذا مناسب ہے کہ پاؤں کو دھو لیا جائے اور سر کا مسح کر لیا جائے (۱) اسطرح انہوں نے اپنے اجتہاد اور استحسان کو ظاہر قرآن پر ترجیح دیتے ہوئے مسح کو چھوڑ دیا ہے اور آیت کی غلط توجیہ کر دی ہے۔

اس گروہ نے شاید اس بات کو بھلا دیا ہے کہ وضو نظافت اور عبادت دونوں کا مرکب ہے سر کا مسح کرنا وہ بھی بعض کے فتوی کے مطابق صرف ایک انگلی کے ساتھ، نظافت کا فائدہ نہیں دیتا ہے اس طرح پاؤں کا مسح بھی۔

حقیقت میں سر اور پاؤں کا مسح اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ وضو کرنے والا آدمی سر سے لیکر پاؤں تک اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ ورنہ نہ تو سر کا مسح نظافت کا موجب بنتا ہے اور نہ ہی پاؤں کا مسح۔

بہر حال ہم اللہ تعالیٰ کے فرمان کے تابع ہیں اور ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ اپنی ناقص عقول کے ساتھ احکام الٰہی میں تبدیلیاں کریں۔ جس وقت قرآن مجید نے پیغمبرؐ پر نازل ہونے والی آخری سورت میں حکم دے دیا ہے کہ اپنے ہاتھ اور منہ کو دھولو اور سر اور پاؤں کا مسح کرلو تو

(۱) المغنی ابن قدامہ، جلد ۱، [illegible]

پھر اپنی ناقص عقلوں کے ذریعے فلسفہ بافی کر کے اس حکم کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے اور ان نامعقول باتوں کی توجیہ کے لیے کلام خدا کی نامعقول توجیہات نہیں کرنی چاہئیں۔

تفسیر بالرائی اور نص کے مقابلے میں اجتہاد وہ عظیم مصیبتیں ہیں جنہوں نے بعض مقامات میں فقہ اسلامی کے چہرے کو مخدوش کر دیا ہے۔

جوتوں پر مسح کرنا!

واقعا یہ عجیب بات ہے کہ جس نے ہر غیر جانبدار محقق کو حیرت میں ڈال دیا ہے کہ یہی برادران کہ جو وضو میں پاؤں پر مسح کے جائز نہ ہونے پر اتنا اصرار کرتے ہیں اور پاؤں دھونے کو واجب سمجھتے ہیں، کثر وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ پاؤں دھونے کی بجائے جوتوں پر مسح کیا جا سکتا ہے وہ بھی مجبوری کے عالم میں نہیں بلکہ اختیاری حالت میں اور صرف سفر میں نہیں بلکہ حضر میں بھی اور ہر حال میں جوتوں پر مسح کیا جا سکتا ہے۔

انسان واقعا اس قسم کے احکام پڑھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ پاؤں کا دھونا واجب تھا اور یا جوتوں کے اوپر سے مسح جائز ہو گیا ہے!

البتہ ایک گروہ کہ جو فقہ اہلسنت کی نظر میں فقیہ شمار ہوتے ہیں جوتوں پر مسح کو جائز نہیں سمجھتے ہیں جیسے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام، جناب ابن عباس اور امام مالک کہ جو اہلسنت کے ایک امام ہیں (ان کے فتوی کے مطابق جوتوں پر مسح جائز نہیں ہے)۔

دلچسپ یہ ہے کہ حضرت عائشہ کہ اہلسنت برادران جنکے فتاوی اور روایات کے لیے خاص اہمیت کے قائل ہیں، ایک مشہور حدیث میں فرماتی ہیں کہ "لئن تقطع قدمای أحب الی من ان امسح علی الخفین" اگر میرے دونوں پاؤں کاٹ دیئے جائیں میرے لیے

اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں (وضو میں) جوتوں پر مسح کروں"(۱)

جبکہ وہ دن رات پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ تھیں اور آپ کا وضو دیکھ چکی تھیں۔

بہر حال اگر یہ برادران اہل بیت رسولؑ کی احادیث کی پیروی کرتے کہ جو ظاہر قرآن کے مطابق ہیں تو کبھی بھی پاؤں کے مسح کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہ کرتے۔

پیغمبر اکرمؐ نے معتبر اور صحیح حدیث میں فرمایا کہ "میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب خدا اور دوسری میری عترت اور اہلبیت کہ اگر ان دونوں سے تمسک کرو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ تین چیزوں میں، میں کسی سے تقیہ نہیں کرتا ہوں ۱۔ مسکرات کے نہ پینے میں (چونکہ بعض فقہاء نبیذ کو جائز سمجھتے تھے) ۲۔ جوتوں پر مسح والے مسئلہ میں ۳۔ حج تمتع میں۔ "ثلاثة لا اتقی فیهن احداً شرب المسکر و مسح الخفین و متعة الحج" (۲)

پاؤں پر مسح اور احادیث اسلامی:

امامیہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ وضو میں پاؤں کے مسح کے علاوہ کوئی چیز قابل قبول نہیں ہے۔ اور اس مسئلہ میں اہلبیتؑ کے واسطے سے منقول روایات بھی بالکل واضح ہیں۔ آپ نے امام باقرؑ سے نقل کی گئی مذکورہ بالا روایت کو ملاحظہ فرمایا کہ جو بالکل واضح ہے، اسی قسم کی اور بہت سی روایات موجود ہیں۔

۱) مبسوط سرخسی جلد ۱ ص ۹۸۔
۲) کافی جلد ۳ ص ۳۲۔

لیکن جو احادیث اہلسنت کی کتب میں بیان ہوئی ہیں وہ ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہیں۔ بعض احادیث پاؤں پر مسح کی طرف اشارہ یا صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ سر کے مسح کے بعد پاؤں پر مسح کرتے تھے، جبکہ بعض دوسری احادیث میں پاؤں دھونے کو پیغمبرؐ کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ اور بعض میں جوتوں پر مسح کرنے کی نسبت دی گئی ہے!

احادیث کی پہلی قسم کہ جو صرف مسح کا حکم دیتی ہیں اہلسنت کی معروف کتب میں موجود ہیں جیسے

۱ صحیح بخاری	۲ مسند احمد
۳ سنن ابن ماجہ	۴ مستدرک حاکم
۵ تفسیر طبری	۶ در المنثور
۷ کنز العمال	

وغیرہ کہ ان کتب کا معتبر ہونا اہلسنت کے نزدیک مسلم ہے۔

اور ان روایات کے راوی بھی مشہور اصحاب میں سے ہیں۔ جیسے

۱۔ امیر المومنین علیؑ
۲۔ جناب ابن عباس
۳۔ انس بن مالک (پیغمبر اکرمؐ کے مخصوص خادم)
۴۔ جناب عثمان بن عفان
۵۔ بسر بن سعید
۶۔ رفاعہ
۷۔ ابو ظبیان وغیرہ

ہم یہاں ان روایات میں سے صرف پانچ کو نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

ہمیں تعجب تو آلوسی جیسے مشہور مفسر کی بات پر ہے، وہ کہتے ہیں کہ پاؤں پر مسح کے بارے میں صرف ایک روایت ہے جو شیعوں کے لیے ثبوت بن گئی ہے۔"(۱)

۱. عن علی ابن ابی طالب (ع) قال: کنت اری ان باطن القدمین احق بالمسح من ظاهرهما حتی رایت رسول الله (ص) یمسح ظاهرهما

"امیر المومنین علیؑ فرماتے ہیں کہ میں خیال کرتا تھا کہ پاؤں کے تلوے ان کی پشت کی نسبت مسح کرنے کے زیادہ سزاوار ہیں یہاں تک کہ میں نے رسولؐ خدا کو دیکھا کہ پاؤں کی پشت پر مسح کرتے ہیں"(۲)

۲. عن ابی مطر قال: بینما نحن جلوس مع علیؑ فی المسجد، جاء رجل الی علیؑ و قال: ارنی وضوء رسول الله فدعا قنبر فقال ائتنی بکوز من ماء، فغسل یده و وجهه ثلاثا فادخل بعض اصابعه فی فیه و استنشق ثلاثا و غسل ذراعیه ثلاثا و مسح راسه واحدة ... و رجلیه الی الکعبین"(۳)

۱) روح المعانی جلد ۶، ص ۷۵۔
۲) مسند احمد جلد ۱، ص ۱۲۴۔
۳) کنز العمال جلد ۹، ص ۴۲۹۔

ابی مطر کہتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ حضرت علیؑ کے ہمراہ مسجد میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی آیا اور آپ کی خدمت میں عرض کرنے لگا کہ مجھے رسولؐ خدا جیسا وضو کر کے دکھایئے، آپ نے قنبر کو آواز دی اور فرمایا کہ پانی کا ایک برتن لے آؤ، اس کے بعد آپ نے ہاتھ اور منہ کو تین مرتبہ دھویا۔ انگلی کے ذریعے دانت صاف کیے اور تین مرتبہ استنشاق کیا (ناک میں پانی ڈالا) اور پھر (چہرے) اور ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا اور ایک مرتبہ سر کا مسح اور ایک مرتبہ ابھری ہوئی جگہ تک پاؤں کا مسح کیا"

اگر چہ دونوں حدیثیں امیر المومنین علیؑ کے توسط سے پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہیں لیکن دو مختلف واقعات کو حکایت کرتی ہیں۔ اور ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ رسولؐ خدا وضو کے دوران پاؤں پر مسح کیا کرتے تھے۔

۳. عن بسر بن سعید قال: اتی عثمان المقاعد فدعا بوضوء فتمضمض و استنشق، ثم غسل وجهه ثلاثا و یدیه ثلاثا ثلاثا ثم مسح براسه و رجلیه ثلاثا ثلاثا، ثم قال: رایت رسول الله هکذا توضا، یا هؤلاء اکذلک؟ قالوا: نعم لنفر من اصحاب رسول الله عنده.(۱)

بسر بن سعید نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمان بیٹھک میں (جہاں لوگ مل بیٹھتے ہیں) آئے اور وضو کے لیے پانی منگوایا اور کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا، اس کے بعد

۱) مسند احمد جلد ۱، ص ۶۷۔

چہرے کو تین مرتبہ دھویا اور دونوں ہاتھوں کو بھی تین تین مرتبہ دھویا اور سر اور پاؤں کا
تین مرتبہ مسح کیا۔ اس کے بعد کہنے لگے میں نے پیغمبر اکرمؐ کو دیکھا ہے کہ اس
طرح وضو فرماتے تھے (اس کے بعد حاضرین محفل کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ
جو اصحاب رسولؐ تھے) اے لوگو! کیا اسی طرح ہے؟ سب نے کہا جی ہاں!"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف حضرت عثمان بلکہ دیگر اصحاب بھی صراحت کے
ساتھ گواہی دیتے تھے کہ پیغمبر اکرمؐ وضو کے وقت پاؤں پر مسح کیا کرتے تھے (اگرچہ اس
روایت میں سر اور پاؤں کا مسح تین مرتبہ ذکر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے بعض اصحاب کی نظر میں یہ
مستحب ہو یا راوی کا اشتباہ ہو)

۶۔ عن رفاعة بن رافع أنه، سمع رسول اللهؐ یقول:
انه لا تتم صلوة لأحد حتى یسبغ الوضوء کما امره
الله عز وجل یغسل وجهه و یدیه الى المرفقین و
یمسح براسه و رجلیه الى الکعبین۔

رفاعہ بن رافع کہتے ہیں کہ میں نے رسولؐ خدا سے سنا فرما رہے تھے تم میں سے کسی کی
نماز اس وقت تک صحیح نہیں ہے جب تک اس طرح وضو نہ کرے جس طرح اللہ تعالیٰ
نے حکم دیا ہے۔ کہ چہرے کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوئے اور سر کا اور پاؤں کا
ابھری ہوئی جگہ تک مسح کرے"(۱)

۱) سنن ابن ماجہ جلد ۱ ص ۱۵۶۔

۵۔ عن ابی مالک الاشعری انه قال لقومه،
اجتمعوا اصلی بکم صلوة رسول الله صلی الله
علیه و آله و سلم فلما اجتمعوا قال هل فیکم احد
من غیرکم؟ قالوا لا الا ابن اخت لنا، قال، ابن
اخت القوم منهم، فدعا بجفنة فیها ماء فتوضا و
مضمض و استنشق و غسل وجهه ثلاثا و ذراعیه ثلاثا
ثلاثا و مسح براسه و ظهر قدمیه ثم صلی بهم،(۱)

ابو مالک اشعری سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ جمع ہو جاؤ تا کہ
میں تمہارے سامنے رسولؐ خدا جیسی نماز پڑھوں۔ جب سب جمع ہو گئے تو انہوں نے
پوچھا تمہارے درمیان کوئی غیر تو نہیں ہے؟ سب نے کہا نہیں صرف ایک ہمارا
بھانجا ہے (کہ ہماری اس بہن کی شادی دوسرے قبیلے میں ہوئی تھی) کہنے لگے،
کوئی بات نہیں۔ بھانجا بھی قبیلہ کا فرد ہوتا ہے (اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس
دور کی حکومت کی طرف سے۔ بعض سیاسی مسائل کی وجہ سے رسولؐ خدا کی نماز یا وضو
کی وضاحت کرنا ممنوع تھی) اس کے بعد انہوں نے پانی کا برتن منگوایا اور اس طرح
وضو کیا۔ کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا اور چہرے کو تین مرتبہ دھویا اسی طرح ہاتھوں
اور بازوؤں کو تین مرتبہ دھویا اس کے بعد سر کا اور پاؤں کی پشت کا مسح کیا اس کے
بعد اپنے قبیلے کے ساتھ نماز پڑھی"۔

۱) مسند احمد جلد ۵ ص ۳۴۲۔

مندرجہ بالا نقل ہونے والی روایات، اُن روایات کا مختصر سا حصہ ہیں جو اہلسنت کی معروف کتب میں مشہور راویوں کے توسط سے نقل ہوئی ہیں۔ لہٰذا جو لوگ کہتے ہیں کہ اس بارے میں کوئی روایت نقل نہیں ہوئی یا صرف ایک روایت نقل ہوئی ہے وہ ناآگاہ اور متعصب قسم کے لوگ ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ شاید حقائق سے چشم پوشی کرنے یا ان کا انکار کرنے کی وجہ سے انہیں ختم کیا جا سکتا ہے۔

یہ وہی لوگ ہیں جو سورۂ مائدہ کی آیت کے مسح کے وجوب پر دلالت کرنے سے انکار کرتے ہیں، اور حتیٰ کہ کہتے ہیں کہ یہ آیت صراحت کے ساتھ پاؤں دھونے پر دلالت کرتی ہے جس کی وضاحت سابقہ صفحات پر گذر چکی ہے۔

مخالف روایات:

ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے ہیں کہ سابقہ روایات کے مقابلے میں دو قسم کی دوسری روایات بھی اہلسنت کی معروف کتب میں نقل ہوئی ہیں۔

ان میں سے ایک گروہ وہ روایات ہیں جو کہتی ہیں کہ رسولخداؐ وضو کے وقت پاؤں دھوتے تھے۔ اور دوسرا گروہ ان روایات کا ہے جو کہتی ہیں کہ آپؐ وضو کے وقت نہ پاؤں کو دھوتے تھے اور نہ مسح کرتے تھے بلکہ جوتوں پر مسح کرتے تھے!!

ایسے وقت میں ہمیں علم اصول کے مسلّم قاعدہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگر ایک مسئلے کے بارے میں روایات کے دو گروہ آپس میں متضاد اور متعارض ہوں تو سب سے پہلے دلالت کے لحاظ سے جمع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے یعنی ان روایات کی اس طرح تفسیر کرنی چاہیے کہ تضاد ختم ہو جائے اور روایات آپس میں جمع ہو جائیں (البتہ یہ تفسیر اور جمع عرفی فہم

کے معیاروں کے مطابق ہونی چاہیے)۔

اور اگر یہ جمع دلالی ممکن نہ ہو تو پھر روایات کی قرآن مجید کے ساتھ تطبیق کرنا چاہیے۔ یعنی دیکھنا چاہیے کہ کونسی روایت قرآن مجید کے مطابق ہے اسے اخذ کرنا چاہیے اور دوسری روایت کو ترک کرنا چاہیے۔ یہ ایک قانون ہے جو معتبر ادلّہ کے ذریعے ثابت ہے۔

اب اس قاعدہ کے مطابق ان دو قسم کی (مسح اور دھونے والی) روایات کے درمیان جمع یوں کیا جا سکتا ہے کہ رسولخداؐ وضو کے دوران مسح والے حکم پر عمل کرتے تھے اور بعد میں نظافت کے لیے کبھی پاؤں کو دھو لیا کرتے تھے اور یہ دھونا وضو کا حصہ نہیں تھا۔ بعض راوی جو اس منظر کا مشاہدہ کر رہے ہوتے تھے خیال کرتے کہ یہ پاؤں دھونا وضو کا جزء ہے۔

اتفاق سے شیعوں میں بھی بہت سے افراد اکثر یہی کام کرتے ہیں یعنی وضو میں مسح والے فریضے پر عمل کرنے کے بعد صفائی کی خاطر اپنے دونوں پاؤں کو اچھی طرح دھو لیتے ہیں۔

اور اس زمانے میں اس کام کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی تھی کیونکہ گرمی کی وجہ سے کھلے جوتے پہنے جاتے تھے نہ کہ بند جوتے، اور کھلے جوتے میں پاؤں جلدی آلودہ ہوتے ہیں۔

بہرحال پاؤں کا مسح ایک واجبی فریضہ تھا جو عام طور پر دھوئے جانے والے پاؤں سے جدا تھا۔

یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ بعض فقہاء کو نص کے مقابلہ میں اجتہاد نے اکسایا ہو کہ مسح کے مقابلے میں پاؤں دھونے کا فتویٰ دیں کیونکہ انہوں نے سوچا ہوگا کہ پاؤں کی آلودگی صرف دھونے سے ہی دور ہو سکتی ہے۔ اس لیے انہوں نے سورۂ مائدہ کے ظہور کو ترک کر دیا جو واضح طور پر مسح کا حکم دیتا ہے جیسا کہ علمائے اہلسنت کے بعض کلمات میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہتر یہ ہے کہ آلودگی کو دور کرنے کیلئے پاؤں کو دھو لیا جائے اور مسح کافی نہیں ہے۔

سہل اور آسان شریعت:

یقیناً اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جو روئے زمین کے تمام علاقوں اور تمام زمانوں کے لیئے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مکمل طور پر آسان اور سہل شریعت ہے۔ ذرا سوچیے دن رات میں پانچ مرتبہ پاؤں کو دھونا دنیا کے مختلف علاقوں میں کتنی مشکلات ایجاد کریگا۔ اس سختی کی وجہ سے ممکن ہے بعض لوگ وضو اور نماز سے بیزار ہو جائیں۔

اور یہ نص کے مقابلے میں اجتہاد اور مسح کی روایت کو چھوڑنے کا نتیجہ ہے۔

یہ احتمال بھی منتفی نہیں ہے کہ پاؤں دھونے کی بعض احادیث (نہ ساری احادیث) بنو امیہ کے دور میں کہ جب حدیث گھڑنے کا بازار گرم تھا اور معاویہ جعلی احادیث گھڑنے کے لیے بہت سی رقم خرچ کرتا تھا، جعل کی گئی ہوں۔ کیونکہ سب لوگ جانتے تھے کہ حضرت علی وضو میں پاؤں کے مسح کے قائل ہیں اور معاویہ کا اصرار تھا کہ ہر چیز میں علی کی مخالفت کی جائے اور برعکس عمل کیا جائے۔ مندرجہ ذیل دو احادیث پر غور کیجیے۔

ا۔ صحیح مسلم میں بیان ہوا ہے کہ معاویہ نے سعد بن ابی وقاص کو حکم دیا کہ امیر المومنین علی پر سب و شتم کرے اور لعنت کرے! (کیونکہ سعد بن ابی وقاص سختی کے ساتھ اس کام سے پرہیز کرتے تھے) سعد نے کہا میں نے رسولخدا کی زبان سے تین فضیلتیں علی کے بارے میں سنی ہیں جنہیں میں کبھی نہیں بھلا سکتا ہوں، اے کاش ان میں سے ایک فضیلت میرے لیے بھی ہوتی تو میں اسے عظیم ثروت پر ترجیح دیتا۔ اس کے بعد انہوں نے جنگ تبوک کا واقعہ اور "اما ترضی ان تکون لی بمنزلة هارون من موسی" کا جملہ نقل کیا، اسی طرح جنگ خیبر کا واقعہ اور حضرت علی کی شان میں رسولخدا کا مشہور جملہ جو آپ نے حضرت علی کے بارے

میں فرمایا تھا اور واقعہ مباہلہ کو نقل کیا۔(۱)

اس حدیث سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ معاویہ امیر المومنین علی علیہ السلام کی مخالفت پر کتنا اصرار کرتا تھا۔

۲۔ بہت سی روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں دو گروہوں نے جعل حدیث کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

ایک گروہ۔ بظاہر صالح اور زاہد (مگر سادہ لوح) افراد پر مشتمل تھا جو قصد قربت کے ساتھ احادیث گھڑتا تھا۔ ان میں سے بعض ایسے دیندار لوگ تھے جو لوگوں میں تلاوت قرآن کی رغبت ایجاد کرنے کے لیے اس کی سورتوں کے فضائل کے بارے میں عجیب و غریب احادیث بناتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ کی طرف نسبت دیتے تھے اور مقام افسوس یہ ہے کہ ان کی تعداد بھی کم نہیں تھی!

اہلسنت کے معروف عالم جناب قرطبی اپنی کتاب تذکار کے (ص ۵۵) پر لکھتے ہیں کہ ان احادیث کا کوئی اعتبار نہیں جنہیں جھوٹی احادیث گھڑنے والوں نے قرآن مجید کی سورتوں کے فضائل کے بارے میں جعل کیا ہے۔ کیونکہ یہ کام ایک بڑی جماعت نے قرآن کی سورتوں کے فضائل میں بلکہ تمام اعمال کے بارے میں انجام دیا ہے انہوں نے قصد قربت کے ساتھ احادیث گھڑی ہیں۔ وہ خیال کرتے تھے کہ اس انداز میں لوگوں کو نیک اعمال کی طرف دعوت دیتے ہیں (وہ لوگ جھوٹ کو جو کہ ایک بدترین گناہ ہے زہد و تقاہت کے ساتھ بالکل منافی نہیں سمجھتے تھے!!)

۱) صحیح مسلم، جلد ۷، ص ۱۲۰۔

یہی دانشمند (قرطبی) اپنی کتاب کے بعد والے صفحہ پر خود "حاکم" سے اور بعض شیوخ محدثین سے نقل کرتے ہیں کہ ایک زاہد نے اپنی طرف سے قربۃ الی اللہ قرآن مجید اور اس کی سورتوں کے فضائل کے بارے میں احادیث جعل کیں جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ کام تم نے کیوں کیا ہے؟ تو کہنے لگے میں نے دیکھا ہے کہ لوگ قرآن مجید کی طرف کم توجہ کرتے ہیں انہیں رغبت دلانے کے لیئے میں نے یہ کام کیا ہے۔ اور جب ان کو کہا گیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے خود فرمایا ہے کہ "من کذب علیّ فلیتبوء مقعدہ من النار" جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ تو جواب میں کہنے لگے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ "من کذب علیّ " جس نے میرے خلاف جھوٹ بولا۔ اور میں نے تو آپؐ کے فائدے میں جھوٹ بولا ہے!!

اس قسم کی احادیث نقل کرنے میں قرطبی تنہا نہیں ہیں بلکہ اہلسنت کے بعض دیگر علماء نے بھی انہیں نقل کیا ہے (مزید وضاحت کے لیے کتاب "الغدیر" کی پانچویں جلد میں "کذابین اور وضاعین" کی بحث کی طرف رجوع کیجئے)۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو بھاری رقم لے کر معاویہ اور بنو امیہ کے حق اور امیر المومنین کی مذمت میں احادیث گھڑتے تھے۔ ان میں سے ایک سمرۃ ابن جندب تھا جس نے چار لاکھ درہم معاویہ سے لیے اور یہ حدیث امیر المومنینؑ کی مذمت اور ان کے قاتل کی شان میں گھڑی اور کہا کہ یہ آیت شریفہ "و من الناس من یشری نفسہ ، ابتغاء مرضات اللہ " (۱) علیؑ کے قاتل عبدالرحمن ابن ملجم کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

(۱) سورۂ بقرہ آیت ۲۰۷۔

اور یہ آیت "و من الناس من یعجبک قولہ فی الحیاۃ الدنیا " (۱) علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (۲)

اس بناء پر تعجب نہیں ہے کہ علیؑ کی مخالفت میں کچھ روایات وضو میں پاؤں دھونے کے لیے جعل کر دی گئی ہوں۔

جوتوں پر مسح، عقل و شرع کے ترازو میں:

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ پاؤں پر مسح کے مسئلہ کی صدات کے ساتھ نفی کرتے ہیں اور پاؤں دھونے کو واجب سمجھتے ہیں۔ وہی لوگ اجازت دیتے ہیں کہ وضو میں جوتوں پر مسح کیا جا سکتا ہے اور دلیل کے طور پر پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہونے والی بعض روایات کو پیش کرتے ہیں حالانکہ اہلبیتؑ کے توسط سے نقل ہونے والی احادیث عموماً اس بات کی نفی کرتی ہیں اور خود اہلسنت کے واسطہ سے نقل ہونے والی متعدد معتبر احادیث صریحاً اس کے خلاف ہیں۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ احادیث اہل بیت (ع) کی پیروی کرتے ہوئے شیعہ فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جوتوں پر مسح کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ لیکن بہت سے اہلسنت فقہاء نے اس کام کو سفر اور حضر میں بطور مطلق جائز قرار دیا ہے، گرچہ بعض علماء نے اسے ضرورت کے مقامات میں منحصر کیا ہے۔

(۱) سورۂ بقرہ آیہ ۲۰۴۔

(۲) شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی طبق نقل تلخیص الشافی شرح حال "سمرہ"۔

یہاں پر چند سوالات سامنے آتے ہیں، منجملہ:

۱۔ پاؤں پر مسح کرنا تو جائز نہیں تو کس طرح جوتوں پر مسح کرنا جائز ہو گیا ہے حالانکہ جب پاؤں دھونے کی بات آتی تھی تو دلیل یہی تھی کہ پاؤں چونکہ آلودہ ہوتے ہیں اس لیے انہیں دھونا بہتر اور مسح کرنا کافی نہیں ہے۔

کیا آلودہ جوتوں پر مسح کر لینا پاؤں دھونے کا قائم مقام بن سکتا ہے۔

جبکہ بہت سے علماء اہلسنت اس بات کے قائل ہیں کہ پاؤں دھونے اور جوتوں پر مسح کرنے میں اختیار ہے۔

۲ کیوں علماء نے قرآن مجید کے ظہور کو ترک کر دیا ہے جس میں مراد پاؤں کے مسح کا حکم تھا اور جوتوں پر مسح کو ترجیح دی ہے؟

۳ کیوں علمائے اہلسنت روایات اہلبیت سے چشم پوشی کرتے ہیں جس میں بالاتفاق جوتوں پر مسح کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ وہ پیغمبر اکرمؐ نے اہلبیتؑ کو ہی قرآن مجید کے ساتھ باعث نجات شمار کیا ہے؟

۴ درست ہے (برادران کی کتب میں) بعض روایات نقل ہوئی ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جوتوں پر مسح کیا ہے لیکن اس کے مقابلے میں دیگر معتبر روایات بھی موجود ہیں جن میں ذکر کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ پاؤں پر مسح کیا کرتے تھے۔ روایات کے تعارض اور تضاد کے وقت کیوں علمائے اہلسنت قرآن مجید کی طرف رجوع نہیں کرتے اور روایات کے اختلاف کے حل کیلئے اسے حاکم قرار دیتے ہوئے اسے اپنا مرجع قرار نہیں دیتے ہیں۔

اس مسئلہ میں ہم جتنا زیادہ غور و فکر کرتے ہیں ہمارے تعجب میں اضافہ ہوتا ہے۔

کتاب "الفقه علی المذاهب الاربعة" میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ ضرورت اور اضطرار کے وقت جوتوں پر مسح کرنا واجب اور بغیر ضرورت کے جائز ہے اگرچہ پاؤں کا دھونا افضل ہے۔

اس کے بعد "حنابلہ" سے نقل کیا گیا ہے کہ جوتوں پر مسح کرنا ان کو باہر نکالنے اور پاؤں دھونے سے افضل ہے۔ کیونکہ اس میں رخصت کا اخذ کرنا اور نعمت کا شکر بجا لانا ہے۔

امام ابو حنیفہ کے بعض پیروکاروں نے بھی اس بات کی تائید کی ہے۔ (۱)

اس کے بعد اسی کتاب میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ جوتوں پر مسح کرنا بہت سی روایات کے ذریعہ ثابت ہے جو تواتر کے قریب ہیں۔ (۲)

قابل توجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں جوتوں کے بارے میں مفصل بحث کی گئی ہے کہ جیسے جوتوں کی شرائط کیا ہیں، مسح کی مقدار کیا ہے، مسح کی مدت کتنی ہے (یعنی کتنے دن تک لگاتار جوتوں پر مسح کیا جا سکتا ہے) جوتوں پر مسح کرنے کے مستحبات، مکروہات اور مبطلات کیا ہیں۔ اس طرح اگر ایک جوتے پر دوسرا جوتا پہنا ہو اس کا کیا حکم ہے، جوتے کی جنس کیا ہونی چاہیے کیا ضروری ہے کہ جوتا چمڑے کا ہو یا اگر چمڑے کے علاوہ کسی اور چیز سے بنایا گیا ہو تو کافی ہے۔

اسی طرح شگاف دار جوتوں اور بے شگاف جوتوں کا کیا حکم ہے؟ الغرض اس کتاب میں بہت مفصل گفتگو انہی جوتوں کے بارے میں کی گئی ہے۔ (۳)

۱۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد ۱، ص ۱۳۵۔
۲۔ ایضاً، ص ۱۳۶۔
۳۔ ایضاً، ص ۱۳۵ تا ص ۱۴۷۔

۵ علماء اہلسنت کیوں جوتے پر مسح والی روایات کو ضرورت، سفر اور جنگ کے موارد اور جہاں جوتوں کا اتارنا ممکن نہیں یا بہت ہی مشکل ہے، حمل نہیں کرتے یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب نہیں ہے اور صرف پہلے ہی سے تعصب کر لینا اس سادہ سے مسئلہ میں شور و غل کا باعث بنا ہے۔

میں نے خود جدہ ائیر پورٹ پر مشاہدہ کیا کہ برادران اہلسنت میں سے ایک آدمی وضو کے لیے آیا اس نے وضو کے دوران اچھی طرح اپنے پاؤں کو دھویا۔ اس کے بعد دوسرا شخص آیا اس نے ہاتھ، منہ دھونے کے بعد جوتوں پر ہاتھ پھیر لیا اور نماز کے لیے چلا گیا میں حیرت میں ڈوب گیا اور سوچنے لگا کہ کیا ممکن ہے کہ پیغمبر اکرمؐ جیسے حکیم کی طرف سے ایسا حکم دیا گیا ہو جس کی توجیہ ممکن نہیں ہے۔

ان سوالات کے بعد ضروری ہے کہ ہم اس مسئلہ کے اصلی مدارک کی تلاش میں جائیں۔ اور روایات کے درمیان سے اس فتویٰ کے اصلی نکتہ اور اسی طرح ایک عقلی راہ حل کو تلاش کریں۔

روایات چند قسم پر مشتمل ہیں۔

الف) جو روایات اہلبیتؑ کے منابع میں نقل ہوئی ہیں وہ عام طور پر بلکہ بالاتفاق جوتے پر مسح کرنے سے منع کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر

۱۔ شیخ طوسی نے ابو وردہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقرؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ ابوظبیان نقل کرتا ہے کہ میں نے حضرت علیؑ کو دیکھا کہ انہوں نے پانی پھینک دیا اور جوتوں پر مسح کر لیا۔ آپ نے فرمایا ابوظبیان جھوٹ بولتا ہے۔

"اما بلغکم قول علیؑ فیکم سبق الکتاب الخفین؟ فقلت هل فیهما رخصة؟ فقال الا من عدو تتقیه او ثلج تخاف علی رجلیک"(۱)

کیا تم نے نہیں سنا ہے کہ علیؑ نے فرمایا ہے کتاب خدا (سورۂ مائدہ کی آیت جو پاؤں کے مسح کا حکم دیتی ہے) جوتوں پر مسح کرنے والے حکم پر مقدم ہے میں نے عرض کی کیا جوتوں پر مسح کرنے کے بارے میں کوئی رخصت ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ دشمن کے خوف سے تقیہ کرنا مقصود ہو یا برف باری کی وجہ سے تمہارے پاؤں کو خطرہ ہو۔

اس حدیث سے چند نکات کا استفادہ ہوتا ہے۔

اولاً: حالانکہ اہلسنت کی روایت میں مشہور یہ ہے کہ حضرت علیؑ جوتے پر مسح کو جائز نہیں کہتے تھے۔ پھر کس طرح ابوظبیان وغیرہ نے جرأت کی ہے کہ آپ کی طرف جھوٹی نسبت دیں کیا یہ کوئی سازش تھی؟ اس سوال کا جواب ہم بعد میں دیں گے۔

ثانیاً: حضرت علیؑ نے راستہ دکھایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید ہر چیز پر مقدم ہے، کوئی چیز قرآن مجید پر مقدم نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی روایت ظاہری طور پر قرآن مجید کے خلاف ہو تو اس کی توجیہ و تفسیر کرنی چاہیے۔

بالخصوص اگر کوئی روایت سورۃ مائدہ (وہ سورۃ جس میں وضو کا حکم بیان ہوا ہے) کے خلاف ہو کہ اس کی کوئی بھی آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔

۱۔ تہذیب الاحکام جلد ۱، حدیث ۱۰۹۲۔

ثالثاً امام محمد باقر علیہ السلام نے بھی رہنمائی کی ہے کہ اگر جوتوں پر مسح کے بارے میں کوئی روایت وارد ہوئی ہو تو اسے ضرورت و اضطرار، جیسے شدید سردی کہ جس کی وجہ سے پاؤں کو خطرہ ہو، پر حمل کیا جائیگا۔

۲۔ مرحوم شیخ صدوقؒ نے "من لا یحضرہ الفقیہ" میں ایک حدیث میں امیرالمومنینؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"إنا أهل بيت لا نمسح على الخفين فمن كان من شيعتنا فليقتد بنا وليستن بسنتنا" (۱)

کہ ہم خاندان اہلبیت جوتے پر مسح نہیں کرتے ہیں پس جو بھی ہمارا پیروکار ہے ہماری اقتدا کرے اور ہماری سنت کے مطابق عمل کرے۔

۳۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے عجیب تعبیر نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"من مسح على الخفين فقد خالف الله و رسوله و كتابه و وضوءه لم يتم و صلاته غير مجزية" (۲)

جس نے جوتے پر مسح کیا اس نے خدا، رسول اور قرآن مجید کی مخالفت کی، اس کا وضو درست نہیں ہے اور اس کی نماز کفایت کرنے والی نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے جو روایت جوتوں پر مسح کی ممنوعیت کے بارے میں نقل ہوئی ہے

۱) من لا یحضرہ الفقیہ، جلد ۱، ص ۴۸۔

۲) وسائل الشیعہ، جلد ۱، ص ۲۷۹۔

ہمیں جناب فخر رازی کی اس بات کی یاد دہانی ہے جو انہوں نے بسم اللہ کے جہر و اخفاء والے مسئلہ میں بیان کی ہے۔ بسم اللہ کے بارے میں کچھ لوگ قائل تھے کہ اس کا "آہستہ" پڑھنا واجب ہے جبکہ حضرت علی علیہ السلام بسم اللہ کو بالجہر پڑھنا ضروری سمجھتے تھے تو اس پر جناب فخر رازی کہتے ہیں کہ

"من اتخذ عليا إماما لدينه فقد استمسك بالعروة الوثقى في دينه ونفسه" (۱)

جس نے دین میں حضرت علیؑ کو اپنا پیشوا بنایا تو وہ اپنے دین اور نفس میں عروۃ الوثقیٰ (مضبوط سہارے) سے متمسک ہو گیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود ہم دیگر روایات کو بھی ذکر کر دیتے ہیں تاکہ کسی کو اعتراض نہ رہے

ب) جو روایات جوتوں پر مسح کرنے کی اجازت دیتی ہیں دو قسم کی ہیں

قسم اول: وہ روایات ہیں جو مطلق طور پر اس مسح کی اجازت دیتی ہیں جیسے سعد بن ابی وقاص کی مرفوعہ حدیث جو انہوں نے رسول خداؐ سے جوتوں پر مسح کے بارے میں نقل کی ہے کہ

"انه لا بأس بالوضوء على الخفين" (۲)

ایک دوسری حدیث میں کہ جو بیہقی کی نقل کے مطابق صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حذیفہ سے منقول ہے۔ یوں آیا ہے کہ

"مشى رسول الله إلى سباطة قوم فبال قائما ثم

۱) تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱ ص ۲۰۴۔

۲) السنن الکبری، جلد ۱ ص ۲۶۹۔

"دعا بماء فجعله بماء فتوضأ و مسح علی خفیه"(۱)

انتہائی معذرت اور شرمندگی کے ساتھ ہم اس حدیث کا ترجمہ کر رہے ہیں

"رسول خدا ایک قوم کے کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ گئے اور کھڑے ہو کر پیشاب کیا اس کے بعد پانی مانگا، میں (حذیفہ) ان کے لیے پانی لیکر گیا۔ آپ نے وضو کیا اور جوتوں پر مسح کیا!!"

ہمیں اطمینان ہے کہ یہ حدیث جعلی ہے اور بعض منافقین کی طرف سے رسول خدا کے تقدس کو داغدار کرنے کے لیے جعل کی گئی ہے اور اس کے بعد صحیح بخاری اور صحیح مسلم جیسی کتب میں (مصنفین کی سادگی کی وجہ سے) شامل ہو گئی ہے۔

جو شخص تھوڑی سی بھی شخصیت کا مالک ہو کیا اس قسم کا کام کرتا ہے کہ جس کے بہت سے نامطلوب لوازم ہوں؟ مقام افسوس ہے کہ صحاح ستہ میں اس قسم کی روایات نقل کی گئی ہیں اور آج تک علماء ان روایات سے استدلال کرتے ہیں۔

بہر حال ان روایات اور اس قسم کی دوسری روایات میں جوتوں پر مسح کو بغیر کسی قید و شرط کے ذکر کیا گیا ہے۔

قسم دوم:

ان روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ جوتوں پر مسح (اگر جائز ہے) تو صرف ضرورت کے مقامات کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسے مقدام بن شریح کی روایت جو انہوں نے حضرت عائشہ سے نقل کی ہے۔ وہ کہتا ہے میں نے حضرت عائشہ سے جوتوں پر مسح کے بارے میں

۱) ایضاً ص ۲۸۰۔

سوال کیا، انہوں نے کہا حضرت علی علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ سفر میں رسول خدا کے ہمراہ جاتے تھے میں ان کی خدمت میں آیا اور ان سے اس مسئلہ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا

"کنا اذا سافرنا مع رسول اللہ یامرنا بالمسح علی خفافنا"(۱)

جب ہم رسول خدا کے ہمراہ سفر پر جاتے تھے تو آپ ہمیں جوتوں پر مسح کرنے کا دستور دیتے تھے"

اس تعبیر سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جوتوں پر مسح کرنے کا مسئلہ ضرورت کے موارد کے ساتھ مربوط تھا۔ اس لیئے فرمایا ہے کہ رسول خدا سفر میں یوں دستور دیتے تھے۔ اور اس قسم کی دیگر روایات۔

اہلسنت کے معروف منابع میں ذکر ہونے والی تمام روایات میں (پہلے سے کی جانے والی تفاوت سے چشم پوشی کرتے ہوئے) غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

اگر علم اصول کے مشہور قاعدہ (قاعدہ جمع یعنی مطلق کو مقید کے ذریعے تقیید لگائی جائے) کے مطابق ان روایات کو جو بغیر قید و شرط کے جوتوں پر مسح کو جائز قرار دیتی ہیں موارد ضرورت و اضطرار پر حمل کیا جائے جیسے سفر یا میدان جنگ میں یا اس قسم کے دیگر مقامات میں۔ اور دلچسپ یہ ہے کہ سنن بیہقی میں ایک مفصل باب جوتوں پر مسح کرنے کی مدت کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے اور چند روایات کے ذریعے اس مدت کو سفر میں تین دن اور حضر وغیرہ میں ایک دن بیان کیا گیا ہے۔(۱)

۱) ایضاً ص ۲۷۔

۱) السنن الکبری جلد ۱ ص ۲۷۵ تا ۲۷۶۔

کیا یہ ساری روایات، اس حقیقت کیلئے روشن دلیل نہیں ہیں کہ جوتوں پر مسح کے بارے میں جو کچھ روایات میں بیان کیا گیا ہے وہ ضرورت اور اضطرار کے حالات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور عام حالت میں جوتے نہ اتارنے اور پاؤں پر مسح نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اور یہ جو بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ اجازت امت سے عسر و حرج کو دور کرنے کیلئے ہے یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ عام جوتوں کے اتارنے میں ذرہ بھر زحمت نہیں ہے۔

ثانیاً اہلبیت اور اہلسنت کے معروف منابع میں حضرت علیؑ سے متعدد روایات نقل ہوئی ہیں کہ وہ فرماتے تھے یہ مسح سورۂ مائدہ کی چھٹی آیت کے نزول سے پہلے تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر اجازت تھی بھی تو آیت کے نزول سے پہلے تھی۔ آیت کے نزول کے بعد حتی جنگ اور سفر میں بھی جوتوں پر مسح جائز نہیں تھا۔ کیونکہ جوتے نہ اتار سکنے کی صورت میں اصحاب تیمم کرتے تھے، چونکہ تیمم کا حکم بھی بطور کلی اس آیت کے ذیل میں آیا ہے۔

ثالثاً اگر بعض اصحاب نے پیغمبر اکرمؐ کو حضر میں جوتوں پر مسح کرتے دیکھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے جوتوں پر شگاف تھا جس میں سے پاؤں پر مسح کرنا ممکن تھا۔

مشہور شیعہ محدث مرحوم صدوق اپنی شہرۂ آفاق کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" میں لکھتے ہیں کہ نجاشی نے پیغمبر اکرمؐ کو جوتے ہدیہ میں دیئے تھے جن کے اوپر شگاف تھا، پیغمبر اکرمؐ نے ایک مرتبہ جوتے پہنے ہوئے اپنے پاؤں پر مسح کیا، بعض ناظرین نے گمان کیا کہ آپؐ نے جوتوں پر مسح کیا ہے۔(۱)

معروف محدث جناب بیہقی نے اپنی کتاب "السنن الکبریٰ" میں ایک باب "باب الخف

(۱) من لا یحضرہ الفقیہ، جلد ۱، ص ۳۰۔

الذی مسح علیہ رسول اللہ" (وہ مخصوص جوتے جن پر رسولِ خداؐ نے مسح کیا) کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ اس باب کی بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مہاجرین اور انصار کے جوتے بھی اسی طرح اوپر سے کھلے تھے "و کانت کذلک خفاف المہاجرین و الأنصار مخرقة مشققة"(۱)

اس بناء پر قوی احتمال ہے کہ وہ اصحاب بھی اپنے پاؤں پر مسح کرتے ہوں۔ اس بحث کے عجیب ترین مراحل میں سے ایک یہ ہے کہ جن راویوں نے جوتوں پر مسح والی روایات کو نقل کیا ہے ان میں بعض کبھی کبھار رسولِ خداؐ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ لیکن حضرت علیؑ کہ جو ہمیشہ آنحضرتؐ کی خدمت میں موجود رہتے تھے، اہلسنت کی مشہور روایات کے مطابق اس مسح کے مخالف تھے۔

اس سے زیادہ تعجب آور یہ ہے کہ حضرت عائشہ کہ جو اکثر اوقات آنحضرتؐ کے ہمراہ تھیں فرماتی ہیں

"لئن تقطع قدمای احب الیّ من ان امسح علی الخفین"(۲)

اگر میرے دونوں پاؤں کٹ جائیں یہ میرے لیے اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں اپنے جوتوں پر مسح کروں"

(۱) السنن الکبریٰ، جلد ۱، ص ۲۸۳۔
(۲) صحیح بخاری، جلد ۱، ص ۹۸۔

بحث کا آخری نتیجہ:

۱۔ قرآن مجید نے وضو میں اصلی فریضہ پاؤں کے مسح کو قرار دیا ہے (سورۂ مائدہ آیت ۶) اس طرح اہلبیت علیہم السلام کی تمام روایت اور انکی اتباع کرنے والے تمام امامیہ فقہاء کا فتویٰ بھی اسی آیت کے مطابق ہے:

۲۔ اہلسنت کے فقہاء، وضو میں اصلی فریضہ فقط پاؤں دھونے کو قرار دیتے ہیں لیکن ان میں، کثر اجازت دیتے ہیں کہ اختیاری صورت میں جوتوں پر مسح کیا جا سکتا ہے البتہ ان میں سے بعض اس مسح کو ضرورت کے موارد میں منحصر کرتے ہیں۔

۳۔ جو روایات اہلسنت کے منابع میں جوتوں پر مسح کے بارے میں ذکر ہوئی ہیں اس قدر مختلف و متناقض ہیں کہ ہر محقق کو شک میں ڈال دیتی ہیں۔ بعض روایات بغیر کسی قید و شرط کے جوتوں پر مسح کی اجازت دیتی ہیں، بعض کلی طور پر منع کرتی ہیں جبکہ بعض ضرورت کے مواقع کے ساتھ مختص کرتی ہیں اور اس کی مقدار سفر میں تین دن اور حضر میں ایک دن بیان کرتی ہیں۔

۴۔ روایات کے درمیان بہترین جمع کا طریقہ یہ ہے کہ اصلی حکم پاؤں پر مسح کرنا ہے (اور انکے عقیدہ کے مطابق پاؤں دھونا ہے) اور ضرورت و اضطرار کے وقت جیسے جنگ اور دشوار سفر کہ جس میں نعلین کے بجائے بند جوتے (انکی تعبیر کے مطابق خُف) پہنتے تھے اور ان کا اتارنا بہت مشکل تھا جوتوں پر (مسح جبیرہ کی مثل) مسح کرتے تھے۔

۹

بسم اللہ

سورۃ الحمد کا جزء ہے

ایک تعجب آور نکتہ: جب شیعیان اہلبیت خانہ خدا کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں تو اس وحدت کو محفوظ رکھنے کے لیے جس کا حکم ائمہ اہلبیت نے دیا ہے وہ اہلسنت برادران کی نماز جماعت میں شرکت کرتے ہوئے مسجد الحرام اور مسجد النبی میں باجماعت نماز کا ثواب حاصل کرتے ہیں۔ تو اس وقت سب سے پہلی چیز جو انکی توجہ کو اپنی طرف جلب کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ امام جماعت سورۃ الحمد کی ابتداء میں یا تو بالکل بسم اللہ پڑھتے نہیں ہیں یا اگر پڑھتے ہیں تو آہستہ اور مخفی انداز میں پڑھتے ہیں حتیٰ کہ مغرب وعشاء کی نماز میں جنہیں باآواز بلند پڑھا جاتا ہے۔

حالانکہ دوسری طرف وہ اس بات کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ موجودہ قرآن مجید کے تمام نسخوں میں کہ جو اکثر مکہ مکرمہ سے شائع ہوتے ہیں سورۃ حمد کی سات آیات ذکر کی گئی ہیں جن میں سے ایک بسم اللہ ہے۔ یہ بات سب کے لیے تعجب کا باعث بنتی ہے کہ قرآن مجید کی سب سے اہم ترین آیت "بسم اللہ" کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا جارہا ہے؟ اور جس وقت لوگ ہم سے سوال کرتے ہیں اور ہم انکے سامنے اس بارے میں اہلسنت کے مذاہب و روایات کے اختلاف کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے تعجب میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔

اس مقام پر ضروری ہے کہ پہلے ہم اس مسئلہ میں موجود فتاویٰ اور اس کے بعد بحث میں وارد ہونے والی مختلف روایات کی طرف رجوع کریں۔

اس مسئلہ میں مجموعی طور پر اہلسنت کے فقہاء تین گروہوں پر مشتمل ہیں۔

۱۔ بعض علما کہتے ہیں کہ سورۂ حمد کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا چاہیے۔ جہری نمازوں میں بلند آواز کے ساتھ پڑھنا چاہیے اور اخفاتی نمازوں میں آہستہ پڑھنا چاہیے۔ یہ امام شافعی اور انکی پیروی کرنے والے علما ہیں۔

۲۔ بعض علما کہتے ہیں کہ بسم اللہ پڑھی چاہیے لیکن ہمیشہ دل میں یعنی آہستہ پڑھنی چاہیے۔ یہ حنبلی علماء (امام احمد ابن حنبل کے پیروکاروں) کا نظریہ ہے۔

۳۔ ایک گروہ بسم اللہ پڑھنے کو اصلاً ممنوع سمجھتا ہے۔ یہ امام مالک کے پیروکار ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے پیروکاروں کی نظر بھی مالکی مذہب والوں کے قریب ہے۔

اہلسنت کے مشہور فقیہ "ابن قدامہ" اپنی کتاب مغنی میں یوں رقمطراز ہیں۔

"ان قراءة بسم الله الرحمن الرحيم مشروعة في اول الفاتحة و اول كل سورة في قول اكثر اهل العلم و قال مالك و الأوزاعي لايقرؤها في اول الفاتحة ۔ ولا تختلف الرواية عن احمد ان الجهر بها غير مسنون ۔۔۔ و يروى عن عطاء و طاووس و مجاهد و سعيد بن جبير الجهر بها و هو مذهب الشافعي ۔۔۔۔(۱)

سورۂ حمد اور ہر دوسری سورت کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کا پڑھنا اکثر اہلسنت کے نزدیک جائز ہے لیکن مالک اور اوزاعی (اہلسنت کے فقہاء) نے کہا ہے کہ سورۂ حمد کی ابتداء میں بسم اللہ نہ پڑھی جائے (اور بسم اللہ کے بالجہر پڑھنے کے بارے میں) جتنی روایات بھی امام احمد بن حنبل سے نقل ہوئی ہیں سب کی سب کہتی ہیں کہ بسم اللہ کو بالجہر (بلند آواز کے ساتھ) پڑھنا سنت نہیں ہے ۔۔۔۔ اور عطا طاؤوس، مجاہد اور سعید بن جبیر سے روایت نقل ہوئی ہے کہ بسم اللہ کو بالجہر پڑھنا چاہیے اور امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے"

(۱) المغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۵۲۱

اس عبارت میں انکے تینوں اقوال نقل ہوئے ہیں:

تفسیر "المنیر" میں وہبہ زحیلی نے یوں لکھا ہے۔

"قال المالكية و الحنفية ليست البسملة باٰية من الفاتحة و لا غيرها الا من سورة النمل ۔۔۔ الا ان الحنفية قالوا يقرء المنفرد بسم الله الرحمن الرحيم مع الفاتحة في كل ركعة سرّاً ۔۔۔ و قال الشافعية و الحنابلة البسملة آية من الفاتحة يجب قرائتها في الصلوة الا ان الحنابلة قالوا كالحنفية يقرؤها سرّاً و لايجهر بها و قال الشافعية يسرّ في الصلوة السرّية و يجهر بها في الصلاة الجهرية(۱)

(۱) تفسیر المنیر جلد ص ۲۶

امام مالک اور ابو حنیفہ کے پیروکار کہتے ہیں کہ بسم اللہ سورہ حمد اور قرآن مجید کی دیگر سورتوں کی جزء نہیں ہے صرف سورہ نمل میں ذکر ہونے والی آیت جو بسم اللہ پر مشتمل ہے سورت کا جزء ہے۔۔۔

لیکن امام ابو حنیفہ کے پیروکار کہتے ہیں کہ جو شخص فرادی نماز پڑھ رہا ہے وہ ہر رکعت میں صرف سورہ حمد کے ساتھ آہستہ آواز میں بسم اللہ پڑھے۔۔۔ لیکن امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے پیروکار کہتے ہیں:

کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت ہے اور نماز میں اس کا پڑھنا واجب ہے اس فرق کے ساتھ کہ حنبلی کہتے ہیں کہ بسم اللہ کو آہستہ پڑھا جائے، بالجہر پڑھنا جائز نہیں ہے لیکن شافعی مذہب والے کہتے ہیں کہ اخفاتی نمازوں (ظہر و عصر کی نماز) میں آہستہ پڑھا جائے اور بالجہر نمازوں (مغرب، عشاء اور صبح کی نماز) میں بلند آواز سے پڑھا جائے"

ان اقوال میں شافعی مذہب والوں کا قول، شیعہ فقہاء کے نظریہ سے نزدیک ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ ہمارے علماء تمام نمازوں میں بسم اللہ کو بالجہر پڑھنا مستحب سمجھتے ہیں اور سورہ حمد میں بسم اللہ پڑھنے کو مطلق طور پر واجب سمجھتے ہیں۔ اور دیگر سورتوں میں مشہور و معروف قول بسم اللہ کا جزء سورہ ہونا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ایک غیر جانبدار محقق واقعاً حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

چونکہ وہ دیکھتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے پورے ۲۳ سال اپنی اکثر نمازوں کو جماعت کے ساتھ اور سب کے سامنے پڑھا۔ اور سب اصحاب نے آنحضرت کی نمازوں کو اپنے کانوں

سے سنا لیکن تھوڑا سا عرصہ گزرنے کے بعد اتنا شدید اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ بسم اللہ کا پڑھنا اصلاً ممنوع ہے جبکہ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ اسکا پڑھنا واجب ہے، ایک گروہ کہتا ہے کہ آہستہ پڑھا جائے جبکہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جہری نمازوں میں بلند آواز سے پڑھنا چاہیے۔

کیا اس عجیب اور ناقابل یقین اختلاف سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ عادی نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ کی پشت پر ایک سیاسی گروہ کا ہاتھ ہے، جس نے متضاد احادیث کو جعل کیا اور انہیں رسالتمآب کی طرف نسبت دے دی ہے۔

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک حدیث نقل کی ہے جو اس راز سے پردہ اٹھاتی ہے وہ کہتے ہیں، مطرف نے "عمران بن حصین" سے نقل کیا ہے کہ جب اس نے بصرہ میں حضرت علی کے پیچھے نماز پڑھی تو کہا

"ذکرنا ھذا الرجل صلاۃ کنا نصلیھا مع رسول اللہ"

اس مرد نے اپنی نماز کے ذریعے ہمیں رسول خدا کی اقتداء میں پڑھی ہوئی نمازوں کی یاد دلا دی ہے۔(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز حتی نماز بھی تبدیل ہو گئی تھی امام شافعی مشہور کتاب "الام" میں "وہب بن کیسان" سے نقل کرتے ہیں کہ "کل سنن رسول اللہ قد غیرت حتی الصلاۃ" پیغمبر اکرمؐ کی تمام سنتوں حتی نماز کو تبدیل کر دیا گیا(۲)

(۱) صحیح بخاری ج۱ ص۱۹۰۔

(۲) ... جلد ۱ ص۲۶۹۔

بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنے کے بارے میں احادیث نبوی

اس مسئلہ کے بارے میں اہلسنت کی معروف کتب میں مکمل طور پر مختلف اقسام کی احادیث نقل ہوئی ہیں۔ یہی احادیث انکے فتوی میں اختلاف کا سبب بنی ہے اور عجیب یہ ہے کہ کبھی ایک ہی شخص راوی نے متضاد روایات نقل کی ہیں۔ جسکے نمونے آپ آئندہ احادیث میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

پہلی قسم کی احادیث:

اس قسم میں وہ روایات ہیں جو نہ صرف بسم اللہ کو سورہ حمد کا جزء شمار کرتی ہیں بلکہ بلند آواز میں پڑھنے کو بھی مستحب (یا ضروری) قرار دیتی ہیں اس گروہ میں ہم پانچ مشہور راویوں کی پانچ احادیث پر اکتفاء کرتے ہیں:

۱۔ یہ حدیث امیر المومنین علیؑ سے نقل ہوئی ہے۔ انکا مقام و منزلت سب پر عیاں ہیں کہ وہ جلوت و خلوت اور سفر و حضر میں رسول خداؐ کے ساتھ رہے ہیں۔ دار قطنی نے اپنی کتاب سنن میں آپؑ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ

"کان النبیؐ یجھر بسم اللہ الرحمن الرحیم
فی السورتین جمیعاً" (۱)

پیغمبر اکرمؐ دو سورتوں (حمد اور بعد والی سورت) میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھتے تھے"

۱) سنن دار قطنی جلد ۱، ص ۳۰۲، اسی حدیث کو سیوطی نے درالمنثور میں جلد ۱، ص ۲۲ پر نقل کیا ہے۔

۲۔ یہ روایت انس بن مالک سے نقل ہوئی ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ کے خصوصی خادم اور جوانی ہی میں آپ کی خدمت میں پہنچ گئے تھے۔ حاکم نے مستدرک میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"صلیت خلف النبی و خلف ابی بکر و خلف
عمر و خلف عثمان و خلف علی کلھم کانوا
یجھرون بقراۃ بسم اللہ الرحمن الرحیم" (۱)

۳۔ حضرت عائشہ عام طور پر شب و روز پیغمبر اکرمؐ کے ہمراہ تھیں۔ دار قطنی کی روایت کے مطابق وہ فرماتی ہیں کہ

"ان رسول اللہ کان یجھر بسم اللہ الرحمن
الرحیم" (۲)

رسول خداؐ بسم اللہ الرحمن الرحیم کو بلند آواز کے ساتھ پڑھتے تھے"

۴۔ اہلسنت کے معروف راوی جناب ابو ہریرۃ کہ جن کی بہت سی روایات کو صحاح ستہ میں نقل کیا گیا ہے یوں کہتے ہیں "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ یجھر بسم اللہ الرحمن الرحیم فی الصلوۃ" کہ رسول خداؐ نماز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم بلند آواز کے ساتھ پڑھا کرتے تھے

۱) مستدرک حاکم، جلد ۱، ص ۲۳۲، میں نے رسول خداؐ، حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی کے پیچھے نماز پڑھی سب کے سب بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھتے تھے۔ (مترجم)

۲) در منثور، جلد ۱، ص ۲۳

یہ حدیث تین معروف کتب "السنن الکبریٰ"(۱) "مستدرک حاکم"(۲) اور "سنن دار قطنی"(۳) میں نقل ہوئی ہے۔

۵۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ جبرائیل امین نے بھی پیغمبر اکرم کو نماز کی تعلیم دیتے وقت بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھا۔ دار قطنی کی نقل کے مطابق نعمان بن بشیر یوں کہتے ہیں: "أمّنی جبرئیل عند الکعبۃ فجھر ببسم اللہ الرحمن الرحیم" جبرائیل امین نے خانہ کعبہ کے پاس میری امامت کی (مجھے نماز پڑھائی) اور بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھا(۴)

دلچسپ یہ ہے کہ بعض معروف علماء نے بسم اللہ بالجہر پڑھنے والی احادیث کو نقل کرنے کے ساتھ یہ تصریح کی ہے کہ ان احادیث کے راوی تمام طور پر ثقہ ہیں جیسے حاکم نے مستدرک میں اس بات کی تصریح کی ہے۔

یہاں ہمیں اس بات کا اضافہ کرنا چاہیے کہ کتب اہلبیت علیہم السلام کی فقہ و حدیث کی کتب میں بسم اللہ کو سورہ حمد کی ایک آیت شمار کیا گیا ہے اور اس بارے میں احادیث تقریباً متواتر ہیں اور اسی طرح بہت سی احادیث میں بسم اللہ کو بالجہر پڑھنے کے بارے میں تصریح کی گئی ہے۔

ان روایات کے بارے میں مزید آگاہی کے لیے کتاب "وسائل الشیعہ" میں "کتاب قرائت" والے ابواب میں سے باب نمبر ۱۱، ۱۲، ۲۱، ۲۲ کی طرف رجوع کیا جائے۔ [illegible]

۱) السنن الکبریٰ جلد ۲ ص [illegible]
۲) مستدرک الصحیحین جلد ۱ ص [illegible]
۳) دار قطنی جلد ۱ ص [illegible]
۴) سنن دار قطنی جلد ۱ ص [illegible]

روایات آئمہ اہلبیت سے نقل کی گئی ہیں اور دیگر معتبر کتب جیسے کافی، عیون اخبار الرضا، اور مستدرک الوسائل میں (نماز میں قرائت قرآن کے مربوط ابواب میں) بھی بہت سی روایات ذکر کی گئی ہیں۔

حدیث ثقلین کی روشنی میں کہ جسے فریقین نے نقل کیا ہے اور اس میں حکم دیا گیا ہے کہ میرے بعد قرآن مجید اور میرے اہلبیت کا دامن تھام کر رکھنا تاکہ گمراہی سے بچے رہو۔ کیا ہمیں اس قسم کے اختلاف انگیز مسئلہ میں مذہب اہلبیت کی پیروی نہیں کرنا چاہیے (تاکہ گمراہی سے محفوظ رہیں)؟!

دوسری قسم کی احادیث:

یہ قسم ان احادیث پر مشتمل ہے جو بسم اللہ کو سورہ حمد کا جزء شمار نہیں کرتیں یا بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھنے سے منع کرتی ہیں۔

۱۔ صحیح مسلم میں قتادہ سے نقل ہوئی ہے جس میں انس کہتے ہیں کہ:

"صلیت مع رسول اللہ (ص) و ابی بکر و عمر و عثمان فلم اسمع احدا منھم یقرء بسم اللہ الرحمن الرحیم"(۱)

میں نے رسول خدا، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے ساتھ نماز پڑھی میں نے کسی سے نہیں سنا کہ انہوں نے الحمد میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی ہو۔"

۱) صحیح مسلم جلد ۲ "باب حجۃ من قال لا یجھر بالبسملۃ" ص [illegible]

توجہ کرنی چاہیے کہ اس حدیث میں حضرت علیؑ کی قراءت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی گئی ہے!

دوسرا تعجب آور ہے کہ ایک معین شخص جیسے انس ایک مرتبہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ، خلفائے ثلاثہ اور حضرت علیؑ کے پیچھے نماز پڑھی۔ سب کے سب بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھتے تھے۔ دوسری جگہ یہی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ اور خلفائے ثلاثہ کے پیچھے نماز پڑھی کسی نے بھی نماز میں بسم اللہ نہیں پڑھی چہ جائیکہ بلند آواز سے پڑھتا۔

کیا ہر صاحب فہم یہاں یہ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتا کہ پہلی حدیث کو بے اثر کرنے کے لیے جاعلین حدیث نے (جیسا کہ عنقریب بیان کیا جائے گا) اس دوسری حدیث کو جعل کیا ہے اور اسے انس کی طرف نسبت دی ہے اور چونکہ حضرت علیؑ کا بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنا مشہور ہے اور ان کے پیروکار جہاں کہیں بھی ہیں یہی کام کرتے ہیں اس لیے ان کا نام نہیں لایا گیا ہے تاکہ ڈھول کا پول نہ کھل جائے؟

۲۔ سنن بیہقی میں عبداللہ بن مغفل سے نقل ہوا ہے وہ کہتے ہیں:

"سمعنی ابی وانا اقرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم فقال ای بنی محدث؟ صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وابی بکر وعمر وعثمان فلم اسمع احداً منہم جہر بسم اللہ الرحمن الرحیم"(۱)

(۱) سنن بیہقی جلد ۲، ص ۵۲

میرے والد نے مجھے نماز میں بسم اللہ پڑھتے سنا تو کہنے لگے کیا بدعت ایجاد کرنا چاہتے ہو؟ میں نے رسول اللہؐ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے پیچھے نماز پڑھی ان میں سے کسی کو میں نے نہیں دیکھا کہ بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھتا ہو"۔

اس حدیث میں بھی حضرت علی علیہ السلام کی نماز کا تذکرہ نہیں ہوا ہے

۳۔ جناب طبرانی کی کتاب "المعجم الاوسط" میں ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ:

"کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ اذا قرء بسم اللہ الرحمن الرحیم ہزء منہ المشرکون وقالوا محمد یذکر الہ الیمامۃ، وکان مسیلمۃ یسمی "الرحمن" فلما نزلت ہذہ الآیۃ امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ ان لا یجہر بہا؟

کہ رسول اللہؐ جب نماز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے تھے تو مشرکین تمسخر کرتے تھے۔ کیونکہ یمامہ کی سرزمین پر خدائی کا دعویٰ کرنے والے مسیلمہ کا نام رحمن تھا۔ اس لیے مشرکین کہتے تھے کہ "رحمن" کی مراد وہی یمامہ کا خدا ہے۔ اس وجہ سے پیغمبر اکرمؐ نے حکم دے دیا تھا کہ اس آیت کو بلند آواز سے نہ پڑھا جائے"

اس حدیث میں جعلی ہونے کے آثار بالکل نمایاں ہیں کیونکہ

اولاً رحمن کا کلمہ قرآن مجید میں صرف بسم اللہ الرحمن الرحیم میں نہیں آیا ہے بلکہ اور بھی ۵۶ مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ صرف سورۂ مریم میں ہی اس کا سولہ ۱۶ مرتبہ تکرار ہوا ہے۔ اگر

یہی وجہ ہے تو قرآن مجید کی دوسری سورتوں کو بھی نہیں پڑھنا چاہیے، کہیں مشرکین مسلمانوں کا مذاق نہ اڑائیں۔

ثانیاً مشرکین تو قرآن مجید کی تمام آیات کا تمسخر کرتے تھے جیسا کہ متعدد آیات میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے من جملہ سورۂ نساء کی چالیس نمبر آیت "اذا سمعتم آیات اللہ یکفر بھا و یستھزا بھا فلا تقعدوا معھم"

مشرکین نماز کے لیے دی جانے والی اذان کا بھی مذاق اڑاتے تھے جیسے سورۂ مائدہ کی ۵۸ نمبر آیت میں تذکرہ ہوا ہے "و اذا نادیتم الی الصلوۃ اتخذوھا ھزوا" کیا پیغمبر اکرمؐ نے اذان کے ترک کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ یا اذان آہستہ کہنے کا حکم دیا ہے کہ کہیں مشرکین مذاق نہ اڑائیں۔

بنیادی طور پر مشرکین خود پیغمبر اکرمؐ کا استہزاء کرتے تھے جیسا کہ اس آیت میں تذکرہ ہوا ہے "و اذا رآک الذین کفروا ان یتخذونک الا ھزوا" (۱)

اگر یہی دلیل ہے تو خود پیغمبر اکرمؐ کو لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہو جانا چاہیے تھا۔

ان سب امور سے قطع نظر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو بڑی صراحت کے ساتھ وعدہ دیا تھا کہ آپؐ کو استہزا کرنے والوں کے شر سے محفوظ رکھے گا "انا کفینٰک المستھزئین" (۲)

ثالثاً مسیلمہ کوئی ایسی شخصیت نہیں تھا جس کو اسقدر اہمیت دی جاتی کہ پیغمبر اکرمؐ اس کا نام

۱) سورۂ انبیاء آیت ۳۶۔
۲) سورۂ حجرات آیت ۹۵۔

رحمٰن ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کی آیات کو مخفی کرتے یا آہستہ پڑھتے۔ خاص طور پر اس بات کیطرف بھی توجہ رہے کہ مسیلمہ کے دعوے ہجرت کے دسویں سال منظر عام پر آئے تھے اور اس وقت اسلام مکمل طور پر قوت اور قدرت پیدا کر چکا تھا۔

ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث گھڑنے والے اپنے کام میں مہارت نہیں رکھتے تھے اور ناآگاہ تھے۔

۳ ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب "مصنف" میں ابن عباس سے نقل کیا ہے "الجھر ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم قراۃ الاعراب" بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھنا عرب کے بدوؤں کی عادت تھی" (۱)

حالانکہ ایک اور حدیث میں علی ابن زید بن جدعان نے بیان کیا ہے کہ "عبادلہ" (یعنی عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن زبیر) تینوں بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھتے تھے" (۲)

اس سے بڑھ کر حضرت علی علیہ السلام بسم اللہ کو ہمیشہ بالجہر پڑھتے تھے۔ یہ بات تمام شیعہ و سنی کتب میں مشہور ہے کیا علی علیہ السلام بیابانی اعراب میں سے تھے؟! کیا ان متضاد احادیث کا وجود انکے سیاسی ہونے کی دلیل نہیں ہے؟

اس حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام ہمیشہ بسم اللہ کو بالجہر پڑھتے تھے۔ جب امیرالمؤمنین کی شہادت اور امام حسن علیہ السلام کی مختصری خلافت کے بعد معاویہ کے ہاتھ میں حکومت

۱) مصنف ابن ابی شیبہ، جلد ۱ ص ۸۹۔
۲) [illegible] جلد ۱ ص ۲۱۔

کی باگ ڈور آ گئی، تو اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ تمام آثار علوی کو عالم اسلام کے صفحے سے مٹا دے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسند توں میں آپؑ کے فکری اور معنوی افکار کا نفوذ اس کی سلطنت کے لیے خطرہ ہے۔

اس بات کا منہ بولتا ثبوت اس حدیث میں ملتا ہے جسے حاکم نے مستدرک میں نقل کیا اور معتبر قرار دیا ہے (پیغمبر اکرمؐ کے خصوصی خادم) جناب انس بن مالک فرماتے ہیں کہ معاویہ مدینہ میں آیا اس نے جہری نماز (مغرب، عشاء، یا صبح کی نماز) میں سورۃ الحمد سے پہلے بسم اللہ کو پڑھا لیکن بعد والی سورت میں نہیں پڑھا۔ جب نماز ختم کی تو ہر طرف سے مہاجرین و انصار کی (کہ جو شاید جان بچانے کی خاطر نماز میں شریک ہوئے تھے) صدائیں بلند ہو گئیں "اسرقت الصلوۃ ام نسیت؟!" کہ تو نے نماز میں سے چوری کی ہے یا بھول گیا ہے؟! معاویہ نے بعد والی نماز میں سورۂ حمد سے پہلے اور بعد والی سورت سے پہلے بھی بسم اللہ پڑھی"(۱)

معاویہ گویا اس بات کے ذریعے مہاجرین و انصار کو آزمانا چاہتا تھا کہ یہ لوگ بسم اللہ اور اس کے بالجہر پڑھنے کے سلسلہ میں کتنی توجہ و سنجیدگی رکھتے ہیں۔ لیکن اس نے اپنا کام شام اور دیگر علاقوں میں جاری رکھا۔

ما بین الدفتین قرآن ہے:

یقیناً جو کچھ قرآن کی دو جلد کے درمیان ہے وہ قرآن مجید کا جزء ہے۔ یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ بسم اللہ قرآن مجید کا جزء نہیں ہے صرف سورتوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے

(۱) مستدرک، تفسیر، جلد۱، ص۲۳۳۔

کے لئے ہے۔ اولاً یہ بات سورۂ حمد کے بارے میں صحیح نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ قرآن مجید کے تمام نسخوں میں آیات کے نمبر لگائے گئے ہیں۔ بسم اللہ کو سورۂ حمد کی آیت شمار کیا گیا ہے۔

ثانیاً یہ سورتوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والا کام کیوں سورۂ براءۃ میں نہیں کیا گیا ہے۔ اور اگر جواب میں کہا جائے کہ چونکہ اس سورت کا سابقہ سورۂ (سورۃ انفال) کے ساتھ رابطہ ہے تو یہ بات کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ نہ تو سورۂ انفال کی آخری آیات اور سورۂ براءۃ کی ابتدائی آیات کے درمیان کوئی معنوی رابطہ نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں اور کئی سورتیں ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھتی ہیں لیکن بسم اللہ نے انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔

حق یہ ہے کہ کہا جائے بسم اللہ ہر سورہ کا جزء ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کا ظاہر بھی اس بات کی خبر دیتا ہے۔ اور اگر سورۂ توبہ میں بسم اللہ کو ذکر نہیں کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے اس سورت کا آغاز پیمان شکن دشمنوں کے ساتھ اعلان جنگ کے ذریعے ہوتا ہے اور اعلان جنگ، رحمن اور رحیم کے نام کے ساتھ سازگاری نہیں رکھتا ہے کیونکہ یہ نام رحمت عامہ اور رحمت خاصۂ الٰہی کی حکایت کرتا ہے۔

بحث کا خلاصہ:

۱۔ پیغمبر اکرمؐ سورۂ حمد اور دیگر تمام سورتوں کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھتے تھے (ان کثیر روایات کے مطابق جو آپؐ کے نزدیک ترین افراد سے نقل ہوئی ہیں) اور متعدد روایات کے مطابق آپ بسم اللہ کو بالجہر پڑھا کرتے تھے۔

۲۔ سابقہ روایات کے مقابلے میں جو روایات کہتی ہیں کہ بسم اللہ اصلاً قرآن مجید کا جزء

نہیں ہے یا آنحضرتؐ ہمیشہ اسے با اخفات پڑھتے تھے۔ مشکوک ہیں بلکہ خود ان روایات میں ایسے قرائن موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ روایات جعلی اور ان کے پیچھے خواہش کی پراسرار سیاستیں ہیں۔ کیونکہ یہ بات مشہور تھی کہ حضرت علی علیہ السلام بسم اللہ کو بالجہر پڑھتے ہیں اور یہ تو معلوم ہے کہ جو کچھ بھی حضرت علیؑ کی خصوصیت یا علامت شمار ہوتی تھی (اگر چہ وہ پیغمبر اکرمؐ سے حاصل کی ہوئی ہوتی تھی) بنو امیہ اس کی شدت کے ساتھ مخالفت کرتے تھے۔ یہ موضوع اس شدید اعتراض کے ذریعے آشکار ہو جاتا ہے کہ جو اصحاب نے معاویہ پر کیا۔ اور اس کے علاوہ بھی قرائن وشواہد موجود ہیں جنہیں ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے۔

۳۔ ائمہ اہلبیت علیہم السلام کا امیر المومنین (کہ انہوں نے سالہا سال پیغمبر اکرمؐ سے بسم اللہ کو بالجہر ادا کرنے کا درس لیا تھا) کی پیروی کرتے ہوئے اس بات پر اتفاق ہے۔ یہاں تک کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں

"اجتمع آل محمد صلى الله عليه وآله على الجهر ببسم الله الرحمن الرحيم"(١)

"کہ آل محمد کا بسم اللہ کے بلند پڑھنے پر اتفاق ہے"

حداقل اس قسم کے مسائل میں حدیث ثقلین پر عمل کرتے ہوئے روایات اہلبیت کیطرف توجہ کرنی چاہیے اور تمام اہلسنت فقہاء کو چاہیے کہ امام شافعی کی طرح حداقل جہری نمازوں میں بسم اللہ کو بالجہر پڑھنا واجب قرار دیں۔

۴۔ حسن اختتام کے عنوان سے اس بحث کے آخر پر دو باتیں جناب فخر رازی صاحب "تفسیر الکبیر" سے نقل کرتے ہیں:

۱) مستدرک الوسائل، جلد ۴، ص ۱۸۹۔

وہ کہتے ہیں کہ

"ان عليا - كان يبالغ في الجهر بالتسمية فلما وصلت الدولة الى بني امية بالغوا في المنع من الجهر سعيا في ابطال آثار علي -"(١)

حضرت علی علیہ السلام بسم اللہ کے بالجہر پڑھنے پر اصرار کرتے تھے، جب حکومت بنو امیہ کے ہاتھ آئی تو انہوں نے بسم اللہ کے بلند پڑھنے سے منع کرنے پر اصرار کیا تا کہ حضرت علی علیہ السلام کے آثار کو مٹایا جا سکے"

اہلسنت کے اس عظیم دانشمند کی گواہی کے ذریعے بسم اللہ کے آہستہ پڑھنے یا اس کے حذف کرنے والے مسئلہ کا سیاسی ہونا اور زیادہ آشکار ہو جاتا ہے۔ اسی کتاب میں ایک اور مقام پر جناب فخر رازی مشہور محدث بیہقی سے اس بات کو نقل کرنے کے بعد کہ حضرت عمر ابن خطاب، جناب ابن عباس، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر سب کے سب بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھتے تھے اس بات کا اضافہ کرتے ہیں،

"اما ان علي ابن ابي طالب كان يجهر بالتسمية فقد ثبت بالتواتر ومن اقتدى في دينه بعلي ابن ابي طالب فقد اهتدى، والدليل عليه قول رسول الله: اللهم ادر الحق مع علي حيث دار"(٢)

۱) تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۱، ص ۲۰۶۔

۲) ایضاً ص ۲۰۴، ۲۰۵

بہر حال حضرت علیؑ بسم اللہ کو بالجہر پڑھتے تھے یہ بات تواتر کے ذریعے ثابت ہے اور جو بھی دین میں حضرت علیؑ کی پیروی کرے گا یقیناً ہدایت پا جائے گا۔ اس بات کی دلیل رسول خدا کی یہ حدیث ہے کہ "بارالٰہا حق کو ہمیشہ علی کے ساتھ رکھ اور حق کو اسی طرف پھیر دے جس طرف علی رخ کرے"

۱۰

اولیائے الٰہی سے توسل

"توسل" قرآنی آیات اور عقل کے آئینہ میں:

درگاہ الٰہی میں اولیائے الٰہی سے توسل کے ذریعہ مادی اور معنوی مشکلات حل کرنے کا مسئلہ، وہابیوں اور دیگر مسلمانوں کے درمیان ایک اہم ترین اور متنازعہ مسئلہ ہے۔ وہابی صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ نیک اعمال کے ذریعے توسل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اولیائے الٰہی کے ساتھ توسل کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ لوگ اسے ایک قسم کا شرک کہتے ہیں۔ جبکہ ان کے دوسرے مسلمان اس توسل کو (جس کے مفہوم کی ہم وضاحت کریں گے) جائز کہتے ہیں۔

وہابیوں کا گمان یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات اس توسل سے منع کرتی ہیں اور اسے شرک قرار دیتی ہیں۔ من جملہ یہ آیت کریمہ۔

"ما نعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى" (۱)

یہ آیت فرشتوں کی مانند معبودوں کے بارے میں ہے کہ جن کے لیے مشرکین کہتے تھے "کہ ہم اس لیے ان کی پوجا کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں خدا کے نزدیک کریں" اور اس بات کو

(۱) سورۂ زمر آیہ ۳۔

قرآن مجید نے شرک قرار دیا ہے۔ ایک اور آیت میں یوں ارشاد رب العزت ہے "فلا تدعوا مع اللہ احداً" خدا کے ساتھ کسی کو نہ پکارو"(۱)

ایک دوسری روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے "والذین یدعون من دونہ لا یستجیبون لھم بشیء" جو غیر خدا کو پکارتے ہیں، وہ ان کی کوئی حاجت پوری نہیں کر سکتے ہیں"(۲)

وہابیوں کا توہم اور خیال یہ ہے کہ یہ آیات اولیائے الٰہی کے ساتھ توسل کرنے کی نفی کر رہی ہیں۔

اس کے علاوہ وہ ایک اور بات بھی کرتے ہیں وہ یہ کہ بالفرض اگر بعض روایات کی روشنی میں پیغمبر اکرم کی زندگی میں ان سے توسل جائز ہو لیکن وفات کے بعد ان سے توسل کے جواز پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

یہ وہابیوں کے دعووں کا خلاصہ تھا لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ اسی قسم کی بے دلیل باتوں کی خاطر وہابیوں نے بہت سے مسلمانوں پر شرک اور کفر کی تہمتیں لگائیں اور ان کے خون بہانے کو مباح قرار دیا ہے، اسی طرح انکے مال کو مباح جانا ہے۔ اسی بہانے بہت سا خون بہایا گیا اور بہت سا مال غارت کیا گیا ہے۔

اس وقت جبکہ ہم انکے عقیدہ کو سمجھ چکے ہیں بہتر ہے کہ اصل مسئلہ کی طرف لوٹ کر اسی توسل کے مسئلہ کو بنیادی طور پر حل کریں۔

۱) سورۂ جن، آیت ۱۸۔
۲) سورۂ رعد، آیت ۱۴۔

سب سے پہلے ہم "توسل" کو لغت، آیات اور روایات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ سب میں "توسل" وسیلہ کے انتخاب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور وسیلہ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو انسان کو کسی دوسرے سے قریب کرے۔

لغت کی مشہور کتاب "لسان العرب" میں توسل کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

"وسّل الی اللہ وسیلۃً اذا عمل عملاً تقرب الیہ والوسیلۃ ما یتقرب بہ الی الغیر، خدا کی طرف توسل کرنا اور وسیلہ منتخب کرنا یہ ہے کہ انسان ایسا عمل انجام دے جس سے اسے خدا کا قرب نصیب ہو، اور وسیلہ اس چیز کے معنی میں ہے جس کے ذریعے انسان دوسری چیز سے نزدیک ہوتا ہے"

مصباح اللغۃ میں بھی یوں ہی بیان کیا گیا ہے "الوسیلۃ ما یتقرب بہ الی الشیء والجمع الوسائل" وسیلہ اس شے کو کہتے ہیں جس کے ذریعے انسان دوسری شے یا شخص کے نزدیک ہوتا ہے اور وسیلہ کی جمع "وسائل" ہے۔

مقاییس اللغۃ میں یوں بیان کیا گیا ہے "الوسیلۃ الرغبۃ و الطلب" وسیلہ رغبت اور طلب کے معنی میں ہے"۔

ان لغت کی کتب کے مطابق، وسیلہ، تقرب حاصل کرنے کے معنی میں بھی ہے اور اس چیز کے معنی بھی ہے جس کے ذریعے انسان دوسری شے کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اور یہ ایک وسیع مفہوم ہے

اب ہم قرآن مجید کی آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں وسیلہ کی اصطلاح دو آیات میں استعمال ہوئی ہے۔

١۔ سورۂ مائدہ کی ٣٥ ویں آیت میں یوں ارشاد ہے۔

"یا ایها الذین آمنوا اتقوا الله و ابتغوا الیه الوسیلة
و جاهدوا فی سبیله لعلکم تفلحون۔"

اس آیت میں تمام اہل ایمان کو مخاطب قرار دیا گیا ہے اور تین دستور بیان کیے گئے ہیں۔

اوّل تقویٰ کا حکم، دوم، وسیلہ منتخب کرنے کا حکم، وہ وسیلہ جو ہمیں خدا سے نزدیک کرے سوم راہ خدا میں جہاد کرنے کا حکم، ان مجموعہ صفات (تقویٰ، توسل اور جہاد) کا نتیجہ یہ ہے جسے آیت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے "لعلکم تفلحون" یعنی یہ صفات تمہاری فلاح اور رستگاری کا باعث ہیں"

٢۔ سورۂ اسراء کی آیت ٥٧ میں وسیلہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آیت ٥٧ کے معنی کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے آیت ٥٦ کا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں یوں ارشاد ہے

"قل ادعوا الذین زعمتم من دونه فلا یملکون
کشف الضر عنکم و لا تحویلا"

اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ خدا کے علاوہ تم جنہیں پکارتے ہو اور انہیں اپنا معبود تصور کرتے ہو انہیں پکار کر دیکھو کہ وہ تمہاری مشکل کو حل کریں، وہ تمہاری کوئی مشکل حل نہیں کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی تبدیلی لا سکتے ہیں"

"قل ادعوا الذین" والے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں معبودوں سے مراد بت یا اس قسم کی کوئی اور چیز نہیں ہے، کیونکہ کلمہ "الذین" صاحب شعور اور صاحب عقل افراد کے

سے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہذا، اس آیت میں وہ فرشتے مراد ہیں جنہیں لوگ پوجتے تھے یا حضرت عیسیٰ مراد ہیں کہ ایک گروہ معبود کے عنوان سے انکی پرستش کرتا تھا۔ یہ آیت بیان کر رہی ہے کہ نہ فرشتے اور نہ ہی حضرت عیسیٰ تمہاری مشکل کو حل کر سکتے ہیں۔

بعد والی آیت میں یوں ارشاد ہے "اولئک الذین یدعون یبتغون الی ربهم الوسیلة، خود یہ لوگ (فرشتے اور حضرت عیسیٰ) وہ ہیں جو خداوند کی بارگاہ میں وسیلے کے ذریعہ تقرب حاصل کرتے ہیں وہ وسیلہ کہ ایهم اقرب جو سب سے زیادہ نزدیک ہو" و یرجون رحمته" اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں" و یخافون عذابه" اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ "ان عذاب ربک کان محذورا" تیرے پروردگار کا عذاب ایسا ہے جس سے سب ڈرتے ہیں"۔

وہابیوں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ گمان کرتے ہیں کہ اولیائے الٰہی کے ساتھ توسل کا مفہوم یہ ہے کہ انہیں (کاشف الضر) سمجھا جائے یعنی انہیں مستقل طور پر مشکلات کا حل کرنے والا سمجھا جائے اور قضائے حاجات اور دفع کربات کا سرچشمہ سمجھا جائے حالانکہ توسل کا یہ معنی نہیں ہے۔

جن آیات کو وہابیوں نے پیش کیا ہے وہ عبادت کے بارے میں بیان کرتی ہیں۔ حالانکہ کوئی بھی اولیائے الٰہی کی عبادت نہیں کرتا ہے۔

ہم جس وقت پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ توسل کرتے ہیں کیا انکی عبادت کرتے ہیں؟ کیا ہم پیغمبر اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ مستقل طور پر مؤثر اور کاشف ضر سمجھتے ہیں؟

جس توسل کی طرف قرآن مجید نے دعوت دی ہے وہ یہ ہے کہ اس وسیلے کے ذریعے خدا

کے نزدیک ہوں، یعنی یہ ذوات مقدسہ، بارگاہ خدا میں شفاعت کرتی ہیں۔ وہ ہیچ جو ہم نے شفاعت کے بارے میں بیان کی ہے۔

درحقیقت توسل کی تعریف اور شفاعت کی واقعیت ایک ہی ہے۔ بہت سی آیات شفاعت کو ثابت کرتی ہیں اور وہ آیات توسل کو بیان کرتی ہیں دلچسپ بات یہ ہے کہ سورہ مائدہ کی ۵۷ نمبر آیت "ایھم اقرب" کے ذریعے توسل کو بیان کرتی ہے یعنی فرشتے اور حضرت عیسیٰ بھی اپنے لیے وسیلہ منتخب کرتے ہیں وہ وسیلہ جو زیادہ نزدیک ہے "ھم" جمع کی ضمیر ہے جو صاحب عقلوں کے لیے استعمال کیجاتی ہے۔ یعنی اولیائے الٰہی اور صالحین کے ساتھ توسل کرتے ہیں، ان صالحین میں سے ہر ایک خدا کے نزدیک تر ہیں۔

بہرحال سب سے پہلے واضح ہونا چاہیے کہ اولیائے الٰہی کے ساتھ توسل کیا ہے؟

کیا یہ توسل ان کی عبادت اور پوجا کرنا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

کیا انہیں مستقل طور پر مؤثر جانتا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ کیا انہیں مستقل طور پر قاضی الحاجات اور کاشف الکربات جانتا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ذوات مقدسہ اس شخص کے لیے جس نے انکے ساتھ توسل کیا ہے خداوند عالم کی بارگاہ میں شفاعت اور سفارش کرتی ہیں۔ اس کی مثال ایسے دی جاسکتی ہے کہ میں کسی بڑی شخصیت کے گھر جانا چاہتا ہوں وہ مجھے نہیں جانتا ہے، میں ایک ایسے شخص کو واسطہ بناتا ہوں کہ جو مجھے بھی جانتا ہے اور اس کے اس شخصیت کے ساتھ بھی تعلقات ہیں۔ اسے کہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں اور اس شخصیت کے ساتھ میرا تعارف کرادیں اور سفارش کردیں۔ یہ کام نہ تو عبادت ہے اور نہ ہی تاثیر میں اسے مستقل سمجھنا ہے۔

یہاں مناسب یہ ہے کہ ہم "ابن علوی" کا کلام نقل کریں جو انہوں نے اپنی مشہور کتاب "مفاھیم یجب ان تصحح" میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے توسل کی حقیقت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اس لیے ہم (اپنی نظر کے مطابق) توسل کا صحیح مفہوم پیش کرتے ہیں۔ اور اسے بیان کرنے سے پہلے محترم قاری کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

۔ توسل دعا کا ایک انداز ہے اور حقیقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کا ایک دروازہ ہے، پس ہدف اور اصلی مقصد اللہ تعالیٰ ہے، اور جس شخصیت کے ساتھ آپ توسل کررہے ہیں وہ واسطہ اور تقرب بہ خدا کا وسیلہ ہے، اگر کوئی توسل میں اس کے علاوہ کوئی عقیدہ رکھتا ہو تو وہ مشرک ہے۔

۲۔ جو انسان کسی شخصیت کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری دیتا ہے حقیقت میں یہ انسان کا اسی شخصیت کے ساتھ اظہار محبت ہے اور وہ اس شخصیت کے بارے میں اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقرب ہے اور بالفرض اگر مسئلہ الٹ ثابت ہوجائے تو اسی انسان اس شخصیت سے مکمل طور پر دوری اختیار کرلیتا ہے بلکہ اس کی مخالفت کرنے لگتا ہے۔ تو ہمیں یہاں تک معیار کا علم ہوگیا ہے کہ توسل کا معیار خداوند کے نزدیک اس شخصیت کا مقرب ہونا ہے۔

۳۔ اگر توسل کرنے والا انسان اس بات کا عقیدہ رکھتا ہو کہ (متوسل بہ) جس شخصیت کے ساتھ اس نے توسل کیا ہے، وہ ذاتی اور مستقل طور پر نفع ونقصان پہنچانے میں اللہ تعالیٰ کی طرح ہے تو ایسا انسان مشرک ہے۔

۴۔توسل کوئی واجب یا ضروری چیز نہیں ہے اور نہ ہی یہ دعا قبول ہونے کا منحصر راستہ ہے، اہم چیز دعا ہے اور خداوند کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے جس صورت میں بھی ہو۔جیسا کہ خود خداوند نے ارشاد فرمایا ہے کہ "واذا سالک عبادی عنی فانی قریب"(۱)

''ابن علوی مالکی'' اس مقدمہ کو بیان کرنے کے بعد، توسل کے بارے میں اہلسنت کے علماء، فقہاء اور متکلمین کے نظریات بیان کرتا ہے۔اور کہتا ہے کہ اعمال صالحہ کے ذریعے توسل الی اللہ کی مشروعیت (جواز) کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے یعنی انسان نیک اعمال کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرے، یہ اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔مثلاً کوئی روزہ رکھتا ہے، نماز پڑھتا ہے، قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے، صدقہ دیتا ہے اور ان اعمال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یہ چیز مسلماً صحیح ہے۔

اس قسم کے توسل کو حتی کہ سلفیوں نے بھی قبول کیا ہے۔من جملہ" جناب ابن تیمیہ نے اپنی مختلف کتب میں بالخصوص اپنی کتاب" القاعدة الجليلة في التوسل و الوسيلة" میں اس قسم کے توسل کو قبول کیا ہے۔

ابن تیمیہ نے اس قسم کے توسل یعنی نیک اعمال کے ذریعے توسل کے جواز کے بارے میں تصریح کی ہے۔پس اختلاف کہاں ہے؟

کیا اختلاف، اعمال صالحہ کے علاوہ توسل کے بارے میں ہے؟ مثلاً اولیائے الٰہی کے ساتھ توسل کیا جائے اور یوں کہا جائے: اللهم انی اتوسل اليك بنبيك محمد"

۱) سورۂ بقرہ آیہ ۱۸۶ (ترجمہ) جب میرے بندے مجھ سے سوال کریں تو میں قریب ہوں"۔

یا الہا میں تیری بارگاہ میں تقرب کے لیے تیرے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو وسیلہ بناتا ہوں۔اس کے بعد ابن علوی اضافہ کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ اس معنی میں اختلاف اور وہابیوں کا اولیائے الٰہی سے توسل کا انکار کرنا حقیقت میں صرف ظاہری اور لفظی اختلاف ہے، واقعی اور حقیقی اختلاف نہیں ہے۔

بالفاظ دیگر صرف لفظوں کا نزاع ہے۔کیونکہ اولیائے الٰہی کے ساتھ توسل حقیقت میں انکے نیک اعمال کے ساتھ توسل ہے اور یہ ایک جائز امر ہے۔

پس اگر مخالفین بھی انصاف اور بصیرت کی نگاہ سے دیکھیں تو انکے لیے مطلب واضح اور تنازعہ ختم ہو جائیگا، اسطرح فتنہ خاموش ہو جائیگا۔اور مسلمانوں پر شرک و ضلالت کی تہمت لگانے کی نوبت نہیں آئیگی۔

اس کے بعد موصوف اس مطلب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جو انسان بھی اولیائے الٰہی کے ساتھ توسل کرتا ہے اس لیے ہے کہ وہ ان سے محبت کرتا ہے۔

اور کیوں اس کے ساتھ محبت کرتا ہے؟ اس لیے کہ اس انسان کا عقیدہ ہے کہ وہ شخص اللہ کا نیک بندہ ہے، یا اس لیے کہ وہ شخص اللہ کے ساتھ محبت کرتا تھا۔یا اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ محبت کرتا ہے۔یا یہ کہ انسان اس وسیلہ کو پسند کرتا ہے اور اس کے ساتھ محبت کرتا ہے۔جب ہم ان تمام امور میں غور و فکر کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان سب کے باطن میں جو پوشیدہ ہے یعنی حقیقت میں یہ خدا کی بارگاہ میں نیک اعمال کے ذریعے توسل ہے۔اور یہ وہی چیز ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔(۱)

۱) کتاب مفاہیم یجب ان تصحح ص ۱۲۶،۱۱۷.

البتہ ہم بعد میں بیان کریں گے کہ اولیائے الٰہی کے ساتھ توسل اگرچہ انکی شان اور مقام کی خاطر ہو یا انکے نیک اعمال کی خاطر اس اعتبار سے کہ یہ ذوات مقدسہ خداوند کی بارگاہ میں آبرومند، عزیز اور سربلند ہیں یا کسی بھی خاطر یہ توسل ہو، تو جب تک انہیں تاثیر میں مستقل نہ سمجھیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انہیں شفیع سمجھیں تو ایسا توسل نہ کفر ہے اور نہ خلاف شرع۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس قسم کے توسل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے شرک تو تب ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں مستقل طور پر مؤثر سمجھیں۔ وہابیوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اس آیت "ما نعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى"(۱) میں "عبادت" اور "شفاعت" کو آپس میں مخلوط کر دیا ہے۔ اور یہ گمان کیا ہے کہ شفاعت بھی شرک ہے۔ حالانکہ ان واسطوں کی عبادت کرنا شرک ہے نہ انکی شفاعت اور انکے ساتھ توسل کرنا شرک ہے۔ (غور کیجیے)

توسل، اسلامی احادیث کی روشنی میں:

آیات توسل، کے اطلاق کے علاوہ، جو ہر اس توسل کو جو اسلام کے صحیح اعتقادی اصولوں کے خلاف نہ ہو، جائز بلکہ مطلوب قرار دیتی ہیں، ہمارے پاس توسل کے بارے میں بہت سی روایات بھی ہیں جو متواتر یا تواتر کے نزدیک ہیں۔

ان میں سے بہت سی روایات خود پیغمبر اکرم کی ذات کے ساتھ توسل سے مربوط ہیں۔ کہ وہ توسل بھی آپ کی ولادت سے پہلے بھی ولادت کے بعد، آپ کی حیات میں یا آپ کی رحلت کے بعد، کیا گیا ہے۔

۱) سورہ زمر آیت ۳۔

البتہ کچھ روایات پیغمبر اکرمؐ کے علاوہ دیگر دینی شخصیات سے توسل کے ساتھ مربوط ہیں۔

ان میں سے بعض روایات، درخواست اور دعا کی صورت بعض بارگاہ الٰہی میں شفاعت کے تقاضے کی صورت میں ہیں بعض میں، اللہ تعالیٰ کو پیغمبر اکرمؐ کے مقام کا واسطہ دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ توسل کی تمام اقسام ان روایات میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اور اس انداز میں ہیں کہ بہانے تلاش کرنے والے تمام وہابیوں پر راستہ بند کر دیتی ہیں۔

اب ان روایات کے چند نمونوں کو ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ پیغمبر اکرمؐ کی ولادت سے پہلے حضرت آدمؑ کا آپؐ سے توسل کرنا

"حاکم" نے "مستدرک" اور دیگر محدثین نے اپنی کتب میں اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس وقت حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو آپ نے اللہ سے دعا کرتے ہوئے عرض کیا "یا رب! اسئلک بحق محمد لما غفرت لی" پروردگار میں تجھے حضرت محمدؐ کے حق کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو نے محمد کو کہاں سے پہچانا حالانکہ ابھی میں نے اسے خلق نہیں کیا ہے؟!

حضرت آدمؑ نے عرض کی پروردگار اس معرفت کا سبب یہ ہے کہ جب تو نے مجھے اپنی قدرت سے خلق کیا اور مجھ میں روح پھونکی، میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو یہ جملہ عرش کے پایے پر لکھا ہوا تھا: "لا اله الا الله محمد رسول الله" اس عبارت سے میں سمجھ گیا کہ یہ جو محمد کا نام تو نے اپنے نام کے ساتھ لکھا ہے وہ تمام مخلوقات میں سے تیرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم تو نے سچ کہا" انه لاحب الخلق الیّ" وہ

میرے نزدیک تمام مخلوقات سے زیادہ محبوب ہے:

""ادعونی بحقه فقد غفرت لک"(۱)

اس کے حق کا واسطہ دے کر مجھ سے مانگ میں تجھے معاف کر دوں گا"

دوسری حدیث حضرت ابو طالب کے توسل کے ساتھ مربوط ہے جو انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے بچپن کے زمانے میں آپؐ کے ساتھ کیا۔ حدیث کا خلاصہ یوں ہے کہ جسے "ابن عساکر" نے "فتح الباری" میں نقل کیا ہے:

کہ ایک مرتبہ مکہ میں خشک سالی ہو گئی، تمام قریش جمع ہو کر حضرت ابو طالبؑ کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ سارے کھیت خشک ہو چکے ہیں، قحط نے ہر جگہ تباہی مچا رکھی ہے۔ آؤ خداوند کے حضور چلیں اور بارش کے لیے دعا کریں۔

حضرت ابو طالبؑ ساتھ چلے اور انکے ساتھ ایک بچہ بھی تھا (بچے سے مراد پیغمبر اکرمؐ ہیں جو ابھی طفولیت کا زمانہ گزار رہے تھے) اس بچے کا چہرہ آفتاب کی طرح درخشاں تھا۔ جناب ابو طالبؑ نے اس بچے کو گود میں لیا ہوا تھا۔ اسی حالت میں اپنی کمر کو خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ لگایا اور اس بچے سے توسل کیا، اسی وقت آسمان پر بادل اُمڈ آئے اور ایسی بارش بری کہ جس کے نتیجے میں خشک بیابان سرسبز ہو گئے۔ اس وقت جناب ابو طالبؑ نے پیغمبرؐ کی شان میں ایک شعر کہا جو یوں ہے۔

۱) حاکم نے مستدرک، جلد ۲ ص ۶۱۵ پر اور حافظ سیوطی نے "الخصائص النبویۃ" میں اسے نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے اسے "دلائل النبوۃ" میں نقل کیا ہے کہ عام طور پر اس کتاب میں وہ ضعیف روایت نقل نہیں کرتے ہیں اور قسطلانی اور زرقانی نے مواہب اللدنیہ میں اس حدیث کو نقل کیا اور صحیح قرار دیا ہے اور دیگر علماء نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ مزید توضیح کے لیے کتاب "مفاہیم یجب ان تصحح" ص ۱۲۱ اور اسکے بعد رجوع کریں۔

"و ابیض یستسقی الغمام بوجهه

ثمال الیتامی عصمة للارامل"(۱)

کہ پیغمبر اکرمؐ کے نورانی چہرے کے صدقے یہ بادل برس رہے ہیں۔ یہ بچہ یتیموں کا ملجا اور بیوہ عورتوں کی پناہ گاہ ہے گا"

ایک نابینا مرد نے پیغمبر اکرمؐ کی ذات سے توسل کیا۔ وہ آپ کی حیات کے زمانے میں آپکی خدمت میں پہنچا، توسل کر کے شفا پائی اور اسکی آنکھیں واپس لوٹ آئیں

یہ روایت صحیح ترمذی، اسی طرح سنن ابن ماجہ، مسند احمد اور دیگر کتب میں نقل ہوئی ہے (۱) اس سے پتہ چلتا ہے کہ سند کے اعتبار سے حدیث محکم ہے۔ بہر حال حدیث یوں ہے۔

""کہ ایک نابینا آدمی آنحضرت کی خدمت میں پہنچا اور عرض کرنے لگا:

اے رسولؐ خدا اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ وہ مجھے شفا دے اور میری آنکھوں کی بینائی مجھے لوٹا دے۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا اگر تو کہتا ہے تو میں تیرے لیے دعا کرنے کو تیار ہوں اور اگر صبر کرتا ہے تو یہ صبر تیرے لیے بہتر ہے (اور شاید تیری مصلحت اسی حالت میں ہو) لیکن اس بوڑھے آدمی نے اپنی حاجت پر اصرار کیا۔ تو اس پر پیغمبر اکرمؐ نے اس بوڑھے آدمی کو حکم دیا کہ مکمل اور اچھے انداز میں وضو کرے اور دو رکعت نماز پڑھے اور نماز کے بعد یہ دعا پڑھے:

"اللھم انی اسئلک و اتوجه الیک بنبیک محمد

نبی الرحمة یا محمد انی اتوجه بک الی

۱) فتح الباری، جلد ۲ ص ۴۹۴، اسی طرح سیرۂ حلبی، جلد ۱ ص ۱۱۶۔

ربّی فی حاجتی لتقضیٰ، اللّٰھم شفّعہ فیّ"(۱)

بارالٰہا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف توجہ کرتا ہوں تیرے نبی محمد مصطفیٰ کے واسطے کہ جو نبی رحمت ہیں۔ اے محمدؐ میں آپؐ کے وسیلے سے اپنے پروردگار کی طرف اپنی حاجت طلب کرنے چلا ہوں تاکہ میری حاجت پوری ہو جائے اور اے اللہ انہیں میرا شفیع قرار دے۔

وہ نابینا آدمی چلا تا کہ وضو کرے، نماز پڑھے اور پیغمبر اکرمؐ کی تعلیم دی ہوئی دعا پڑھے۔ اس حدیث کا راوی عثمان بن عمیر کہتا ہے کہ ہم بہت سے افراد اسی محفل میں بیٹھے ہوئے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہی بوڑھا آدمی مجلس میں داخل ہوا اس حال میں کہ اس کی آنکھیں بینا ہو چکی تھیں اور نابینائی کا کوئی اثر اس پر باقی نہیں تھا۔

دلچسپ یہ ہے کہ بہت سے اہلسنت کے اکابر نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح جانا ہے۔ ابن ماجہ نے بھی کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ رفاعی نے بھی کہا ہے کہ بلاشک و شبہ یہ حدیث صحیح اور مشہور ہے۔(۲)

پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد اُن سے توسل"

اہلسنت کے معروف عالم دین "دارمی" نے اپنی مشہور کتاب "سنن دارمی" میں ایک

۱) صحیح ترمذی، ص ۱۱۹، حدیث ۳۵۷۸ اور سنن ابن ماجہ، جلد ۱، ص ۴۴۱، حدیث ۱۳۸۵، و مسند احمد، جلد ۴، ص ۱۳۸۔

۲) مزید وضاحت کے لیے آپ کتاب مجموعۃ الرسائل والمسائل، جلد ۱، ص ۱۸، طبع بیروت، کی طرف رجوع فرمائیں۔ ابن تیمیہ کی عین عبارت یہ ہے: "ان النسائی و الترمذی رویا حدیثا صحیحا ان النبی علّم رجلا ان یدعو فیسأل اللہ ثم یخاطب النبی فیتوسل بہ ثم یسأل اللہ قبول شفاعتہ"

باب اس عنوان سے قرار دیا ہے کہ "باب ما اکرم اللہ تعالیٰ نبیّہ بعد موتہ" (یہ باب اس کرامت اور احترام کے بارے میں ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبرؐ کے ساتھ مختص کیا ہے ان کی رحلت کے بعد) اس باب میں وہ یوں رقمطراز ہیں۔

"ایک مرتبہ مدینہ میں شدید قحط پڑ گیا۔ بعض لوگ حضرت عائشہ کی خدمت میں گئے اور ان سے چارہ جوئی کے لیے کہا۔ حضرت عائشہ نے فرمایا جاؤ پیغمبر اکرمؐ کی قبر پر چلے جاؤ۔ اور قبر والے کمرے کی چھت میں سوراخ کرو، اس انداز میں کہ آسمان اندر سے نظر آئے اور پھر نتیجہ کی انتظار کرو۔ لوگ گئے انہوں نے اسی انداز میں سوراخ کیا کہ آسمان وہاں سے نظر آتا تھا، بارش برسنا شروع ہو گئی اس قدر بارش برسی کہ کچھ ہی عرصہ میں بیابان سرسبز ہو گئے اور اونٹ فربہ ہو گئے۔(۱)

"پیغمبر اکرمؐ کے چچا حضرت عباسؓ سے توسل":

امام بخاری نے صحیح بخاری میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ میں قحط تھا تو حضرت عمر ابن خطاب نے اللہ تعالیٰ کو حضرت عباس بن عبدالمطلب کا واسطہ دیتے ہوئے باران رحمت طلب کی ان کی دعا کی عبارت یہ تھی "اللّھم انا کنا نتوسل الیک بنبینا و تسقینا و انا نتوسل الیک بعمّ نبینا فاسقنا" بارالٰہا ہم اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ توسل کرتے تھے تو تو ہم پر باران رحمت نازل فرماتا تھا۔ آج ہم تجھے اپنے نبیؐ کے چچا کا واسطہ دے کر دعا کرتے ہیں کہ ہم پر باران رحمت نازل فرما"

راوی کہتا ہے اس دعا کے بعد فراوان بارش نازل ہوئی (۲)

۱) سنن دارمی، جلد ۱، ص ۴۳۔

۲) صحیح بخاری، جلد ۲، ص ۱۶، باب صلاۃ الاستسقاء۔

۲۔ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں امام شافعی سے نقل کیا ہے کہ امام شافعی ہمیشہ اہلبیت رسولؐ کے ساتھ توسل کرتے تھے انہوں نے یہ مشہور شعر ان سے نقل کیا ہے

آل النبی ذریعتی ۔ و هم الیه وسیلتی
أرجوا بهم أعطی غداً بید الیمین صحیفتی

رسولخداؐ کا خاندان میرا وسیلہ ہیں، خداوند کی بارگاہ میں وہی میرے تقرب کا ذریعہ ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ کل قیامت کے دن انکی برکت سے میرا نامہ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں تھمایا جائے'

اس حدیث کو "رفاعی" نے اپنی کتاب "کتاب التوصل الیٰ حقیقۃ التوسّل" میں بیان کیا ہے(۱)

اسی مصنف نے کہ جو توسل کے بارے میں بہت سخت عقیدہ رکھتا ہے۔ اہلسنت کے مختلف منابع سے ۲۶ احادیث توسل کے بارے میں نقل کی ہیں اگر چہ اس کی کوشش یہی رہی ہے کہ بعض احادیث کے بارے میں خدشہ ظاہر کرے لیکن احادیث تواتر کی حد تک یا تواتر کے قریب ہیں اور اہلسنت کی مشہور کتب میں نقل کی گئی ہیں۔ لہٰذا ان احادیث پر اتنی جلدی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور ہم نے تو یہاں پر اس باب سے صرف چند احادیث کا تذکرہ کیا ہے ورنہ اس بارے میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔

۱) التوصل الی حقیقۃ التوسل ص۲۳۸۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ وہابیوں کے بہانے:

متعصب وہابی اپنے ہدف کو ثابت کرنے کیلئے یعنی ان مسلمانوں پر فسق اور کفر کی تہمت لگانے کے لیے کہ جو اولیاء کے ساتھ توسل کرتے ہیں، مندرجہ بالا آیات اور روایات کے مقابلے میں کہ جو مختلف شکلوں میں توسل کو جائز قرار دیتی ہیں بہانے بناتے ہیں اور یہ بہانہ جوئی ایسے ہی ہے جیسے بچے بہانے بناتے ہیں!

کبھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان صالحین اور بزرگان کی ذات سے توسل کرنا حرام ہے ان کے مقام کے ساتھ توسل کرنا حرام نہیں ہے۔ اسی طرح انکی دعا اور شفاعت میں بھی کوئی حرج نہیں ہے صرف انکی ذات کے ساتھ توسل کرنا حرام ہے۔

کبھی کہتے ہیں کہ انکی زندگی میں توسل کرنا تو جائز ہے لیکن وفات کے بعد توسل کرنا جائز نہیں ہے۔ چونکہ جب وہ اس دنیا سے منتقل ہو جاتے ہیں تو ان کا ہمارے ساتھ رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے "انک لا تسمع الموتی" اے پیغمبرؐ آپ مردوں تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتے ہیں"(۱) یعنی آپ کا رابطہ انکے ساتھ منقطع ہو چکا ہے۔

لیکن اس قسم کی بہانہ تراشیاں واقعاً شرمناک ہیں کیونکہ:

اولاً قرآن مجید نے ایک عام حکم بیان کیا ہے ہم اس آیت کے عموم یا اطلاق کے ساتھ تمسک کرتے ہوئے توسل کی ان تمام اقسام کو جائز سمجھتے ہیں جو "توحید عبادی" اور توحید افعالی" کے ساتھ منافی نہ ہوں۔

۱) سورہ نمل آیہ ۸۰۔

قرآن مجید میں ہے "وابتغوا الیہ الوسیلہ" جیسا کہ بیان کیا ہے وسیلہ اس چیز کو کہتے ہیں جو خدا کے تقرب کا ذریعہ بنے۔ پس جو شے بھی آپ کو خدا کے قریب کرنے کا وسیلہ بن سکتی ہے آپ سے انتخاب کر سکتے ہیں۔ چاہے وہ پیغمبرؐ کی دعا ہو یا شفاعت، مقام پیغمبرؐ ہو یا ذات پیغمبرؐ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی، اطاعت، عبودیت اور دیگر صفات حسنہ کی وجہ سے اس کی بارگاہ میں محبوب و مقرب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ ان امور کے ذریعے بارگاہ خدا میں تقرب حاصل کرو۔ پس وسیلہ کو صرف انسان کے اپنے نیک اعمال میں منحصر کرنے پر کوئی دلیل نہیں ہے جس کا وہابی دعویٰ کرتے ہیں۔

وسیلہ کی جو اقسام ہم نے بیان کی ہیں نہ تو یہ توحید در عبادت میں رخنہ پیدا کرتی ہیں کیونکہ ہم صرف خدا کی عبادت کرتے ہیں نہ پیغمبر اکرمؐ کی اور نہ ہی توحید افعالی میں خدشہ پیدا کرتی ہیں، کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ نفع و نقصان کا مالک ہے، اس کے علاوہ جس کسی کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے اور اسی کے واسطہ سے ہے۔

آیت میں اس قسم کے عموم کے بعد اب کس چیز کا انتظار ہے؟

یہ بہانہ تراشی تو ایسے ہے جیسے قرآن مجید فرماتا ہے "**فاقرءوا ما تیسر من القرآن**" جتنا قرآن مجید کی تلاوت کر سکتے ہو کرو" (۱) اب اگر کوئی بہانہ بنائے اور شک کرے کہ کھڑے ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ لیٹ کر تلاوت کرنا کیسے ہے؟ آیت کا عموم کہہ رہا ہے تلاوت قرآن کی تمام اقسام جائز ہیں۔ تلاوت سفر میں ہو یا حضر میں۔ وضو کے ساتھ ہو یا بغیر وضو کے اس وقت تک جائز ہے جب تک کوئی دلیل اس عموم کے خلاف قائم نہ ہو جائے۔

قرآن مجید کے عمومات اور اطلاقات اس وقت تک قابل عمل ہیں، جب تک کوئی مانع اور رکاوٹ درپیش نہ آئے۔ توسل والی آیات بھی عام ہیں اور آیات قرآن کے عموم پر عمل کیا جا سکتا ہے جب تک کوئی مانع نہ ہو۔ پس ہم بھی ان عمومات پر عمل کریں گے اور یہ بہانے تراشیاں قبول نہیں کریں گے۔

ثانیاً توسل کے مسئلہ میں بیان ہونے والی روایات کہ جن میں سے بعض کو ہم نے اوپر پیش کیا ہے اس قدر متنوع ہیں کہ توسل کی تمام اقسام کی اجازت دیتی ہیں۔ خود پیغمبر اکرمؐ کی ذات کے ساتھ توسل جیسے نابینا والے واقعہ میں بیان ہوا۔ پیغمبر اکرمؐ کی قبر مبارک کے ساتھ توسل جیسا کہ بعض واقعات میں بیان ہوا۔ اسی طرح پیغمبر کی دعا سے توسل، انکی شفاعت سے توسل جیسا کہ دیگر واقعات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان متنوع اور مختلف روایات کی روشنی میں بہانہ تراشیوں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

ثالثاً پیغمبر اکرمؐ کی ذات سے توسل سے کیا مراد ہے؟ ہماری نظر میں کیوں پیغمبر اکرمؐ کی ذات کا احترام ہے، وہ ہم انہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفیع بناتے ہیں؟ یہ اس لیے کہ پیغمبر اکرمؐ اطاعت اور عبودیت کی اعلیٰ ترین منزل پر فائز تھے۔ پس حقیقت میں پیغمبر کی ذات کے ساتھ توسل انکی اطاعات، عبادات اور افعال حسنہ کے ساتھ توسل ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے متعصب وہابی بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی قائل ہیں کہ طاعت کے ساتھ توسل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

پس صرف الفاظ کا جھگڑا ہے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بعض وہابی پیغمبر اکرمؐ کی برزخی زندگی کا انکار کرتے ہیں اور انکی وفات کو (معاذ اللہ) کفار کی وفات جیسا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید شہداء کے لیے حیات

جاوید کا تذکرہ کرتا ہے "بل احیاء عند ربھم یرزقون" (۱)

کیا پیغمبر اکرم کا مقام شہداء کے مقام سے کم ہے، جبکہ آپ سب لوگ اپنی نمازوں میں ان پر درود بھیجتے ہیں۔ اگر رسولخدا وفات کے بعد توسل کرنے والوں کے توسل کو نہیں سنتے تو پھر آپ کا سلام بھیجنا بے فائدہ ہے (خدا سے پناہ مانگتے ہیں اس اندھے تعصب سے کہ جو انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتا ہے)۔

البتہ ان میں سے بعض علماء آنحضرت کی حیات برزخی کے قائل ہیں انہیں اپنے اس نظریہ کے مطابق اپنا اعتراض واپس لے لینا چاہیے۔

۲۔ "افراطی اور غالی افراد"

ہم افراط اور تفریط کرنے والے دونوں گروہوں کے درمیان میں ہیں ایک طرف وہ لوگ ہیں جو توسل کے مسئلہ میں منکر ہیں اور اعتراض تراشی کرتے ہیں اور جس توسل کی قرآن و حدیث نے اجازت دی ہے وہ اسے جائز نہیں سمجھتے ہیں۔ اور گمان کرتے ہیں کہ ان کا یہ نظریہ انکی توحید کے کمال کا باعث ہے حالانکہ وہ سراسر غلطی پر ہیں۔ کیونکہ اولیائے الٰہی کے ساتھ! انکی اطاعت، عبادت، اعمال اور بارگاہ الٰہی میں انکے تقرب کیوجہ سے توسل کرنا، مسئلہ توحید پر تاکید ہے اور ہر شے کا خدا سے طلب کرنا ہے۔

دوسری طرف ایک افراطی گروہ ہے جو توسل کی آڑ میں غلو کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ان غالیوں کا خطرہ اور نقصان اس پہلے گروہ سے کم نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ بعض اوقات ایسے جملے استعمال کرتے ہیں جو توحید افعالی کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔ یا بعض اوقات ایسی باتیں

---

۱) سورۂ آل عمران آیت ۱۶۹۔

کرتے ہیں جو عبادت میں توحید کے ساتھ منافی ہیں۔ چونکہ "لامؤثر فی الوجود الّا اللہ" اس عالم وجود میں مؤثر واقعی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور جو کچھ بھی موجود ہے اس کی بدولت ہے۔

لہذا جس طرح ہمیں صحیح توسل کے منکر افراد کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے یا انہیں ارشاد کرنا چاہیے اور غلطیوں سے روکنا چاہیے، اسی طرح افراطی گروہ اور غالیوں کو بھی ارشاد کرنا چاہیے اور انہیں راہ راست کی طرف لوٹانا چاہیے۔

درواقع یہ کہا جاسکتا ہے کہ توسل کے منکرین کی پیدائش کا ایک سبب توسل کے قائل افراد میں سے بعض کا افراط اور غلو ہے جب انہوں نے افراط سے کام لینا شروع کیا تو فطرتی سی بات تھی کہ تفریطی ٹولہ انکے مقابلے میں ایجاد ہو جائیگا۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جو تمام اعتقادی، اجتماعی اور سیاسی مسائل میں پایا جاتا ہے اور انحرافی گروہ ہمیشہ ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہوتے ہیں اور دونوں گروہ غلط راستے پر ہٹ دھرمی کے ساتھ گامزن رہتے ہیں۔

۳: تنہا توسل کافی نہیں ہے۔

لوگوں کو اس بات کی تلقین کرنی چاہیے کہ صرف اولیائے الٰہی اور صالحین کے ساتھ توسل پر اکتفانہ کریں۔ کیونکہ توسل تو ہمارے لیئے ایک درس ہے۔ وہ اسطرح کہ ذہن میں سوال اٹھتا ہے، کہ ہم ان اولیاء کے ساتھ کیوں توسل کرتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ اس لیے توسل کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آبرومند ہیں، کیوں آبرومند ہیں؟! اچھے نیک اعمال کی وجہ سے آبرومند ہیں بس ہمیں بھی نیک اعمال کی طرف جانا چاہیے۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ توسل ہمیں درس دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب نیک اعمال کے ذریعے

حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اور اولیائے الٰہی کے ساتھ توسّل بھی انکے نیک اعمال کیوجہ سے ہی کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے اعمال صالح کیوجہ سے خدا کا قرب حاصل کر چکے ہیں اور ہم توسّل میں ان سے تقاضا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری بھی شفاعت کریں، لہٰذا ہمیں بھی کوشش کرنی چاہیے کہ جس راستے کو انہوں نے طے کیا ہے ہم بھی اس راستے پر عمل پیرا ہوں۔ توسّل کو ایک انسان ساز اور تربیت کرنے والے مکتب میں تبدیل ہونا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم توسّل پر ہی رک جائیں اور اس کے بلند مقاصد کو فراموش کر دیں۔ یہ ایک اہم بات تھی جس کی طرف ہم سب کو متوجہ رہنا چاہیے۔

۳: امور تکوینی میں توسّل:

ایک اور نکتہ جس کی طرف توجہ ضروری ہے، یہ ہے کہ عالم اسباب کے ساتھ توسّل جسطرح امور تشریعی میں موجود ہے اسی طرح امور تکوینی میں بھی موجود ہے اور ان میں سے کوئی سا توسّل بھی توحید کی راہ میں مانع نہیں ہے۔ ہم جس وقت اپنے مطلوبہ نتائج تک پہنچنا چاہتے ہیں تو اپنی عادی زندگی میں اسباب کے پیچھے جاتے ہیں، زمین میں ہل چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں آبیاری کرتے ہیں۔ فصل کی حفاظت کرتے ہیں، اور پھر موقع پر فصل کاٹتے ہیں اور اس سے اپنی زندگی میں استفادہ کرتے ہیں کیا یا اسباب کے ساتھ توسّل کرنا ہمیں اللہ تعالیٰ سے غافل کر دیتا ہے؟ کیا اس بات کا عقیدہ رکھنا کہ زمین سبزہ اگاتی ہے۔ اور سورج کا نور اور بارش کے حیات بخش قطرے بیج، گل و گیاہ اور پھلوں کی پرورش میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یا کلی طور پر عالم اسباب کے وسیلہ ہونے کے بارے میں عقیدہ رکھنا کیا توحید افعالی کے منافی

ہے؟ یقیناً منافی نہیں ہے۔ کیونکہ ہم عالم اسباب میں صرف اسباب مہیا کرتے ہیں اور مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات کو جانتے ہیں۔

پس جس طرح طبیعی اسباب کے ساتھ توسّل کرنا توحید کے ساتھ منافی نہیں ہے سی طرح عالم تشریع میں انبیاء، اولیاء اور معصومینؑ کے ساتھ توسّل کرنا اور ان سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کا تقاضا کرنا بھی توحید کے ساتھ منافی نہیں ہے۔

البتہ اس عالم تکوین کے بارے میں بھی ایک افراطی گروہ موجود ہے جو اصلاً عالم اسباب کا انکار کرتے ہیں۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ عالم اسباب پر عقیدہ رکھنا توحید افعالی کے ساتھ منافی ہے۔ اسی لیے وہ قائل ہیں کہ آگ نہیں جلاتی ہے بلکہ جس وقت آگ کسی شے کے نزدیک ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس شے کو جلاتا ہے، اسی طرح پانی آگ کو نہیں بجھاتا ہے بلکہ جس وقت آگ پر پانی ڈالا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس آگ کو بجھا دیتا ہے۔ یہ لوگ اس انداز میں علت اور معلول کے درمیان پائے جانے والے تمام واضح اور بدیہی روابط کا انکار کرتے ہیں۔

حالانکہ قرآن مجید واضح انداز میں عالم اسباب کو قبول کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہم بادلوں کو بھیجتے ہیں اور یہ بادل تشنہ زمینوں کو سیراب کرتے ہیں اور انکے ذریعے مردہ زمینیں زندہ ہو جاتی ہیں "فیحیی به الارض بعد موتها" (۱)

"فیحیی به" یعنی یہ بارش کے قطرے زمین کو حیات بخشتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی آیات عالم اسباب کے وسیلہ ہونے کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں لیکن بہر حال یہ اسباب ذاتی طور پر کوئی قدرت نہیں رکھتے ہیں بلکہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے۔ یہ آثار اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ جس طرح اسباب طبیعی کے منکر،

(۱) سورۂ روم آیہ ۲۴۔

غافل خطا کار ہیں اسی طرح عالم تشریع میں بھی اسباب کا انکار کرنے والے غلطی پر ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ گذشتہ سطور کی روشنی میں یہ لوگ تعصب سے ہاتھ کھینچ لیں اور صحیح راستہ کا انتخاب کرلیں اور اسطرح بے جا تکفیر اور تفسیق کا خاتمہ ہوجائے اور پوری دنیا کے مسلمان آپس میں اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دشمنوں کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ جائیں جنہوں نے قرآن، اسلام اور خدا کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ اور اسطرح اسلامی تعلیمات کو ہر قسم کے شرک، غلو و زیادتی اور کوتاہی و نقصان سے پاک کرکے پوری دنیا کے سامنے پیش کریں۔

والسلام

شعبان ۱۴۲۶ھ ق

ناصر مکارم شیرازی

﴿التماس سورۃ الفاتحہ﴾

سیدہ فاطمہ رضوی بنت سید حسن رضوی

سید ابوزر شہرت بلگرامی ابن سید رضوی

سید مظاہر حسین نقوی ابن سید محمد نقوی

سید محمد نقوی ابن سید ظہیر الحسن نقوی

سید الطاف حسین ابن سید محمد علی نقوی

سیدہ امِّ حبیبہ بیگم

حاجی شیخ علیم الدین

شمشاد علی شیخ

مسیح الدین خان

فاطمہ خاتون

شمس الدین خان

یا صاحب الزمانؑ ادرکنی

خدمتگارانِ مکتبِ اہلبیت (ع)

سید حسن علی نقوی

حسّان ضیاء خان

سعد شمیم

حافظ محمد علی جعفری

Hassan
naqviz@live.com